

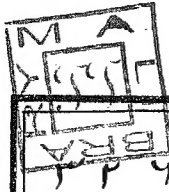
M.A.LIBRARY, A.M.U.



U32608

*Handwritten signature*

CHECKED-2002



# انتساب

”ایوان اشاعت“ اپنی اس کتاب کے صدقیت  
اور خلوص جذبات کے ساتھ جناب سید ضامن علی صاحب  
رئیس گورکھپور کے نام پر معنون کرتا ہے جن کو اسکے ساتھ  
سچی ہمدردی ہے اور جنگی اعانت کو اس کا سنگ بنیاد  
کے بنا چاہئے۔

سکرٹری

ایوان اشاعت

گورکھپور

9 12.5.02

1000

1000

1000

(الف)

## عنوانات

صفحہ	عنوان
۱۱ - ۱ ...	وَرگادوتی
۲۶ - ۱۲ ...	چاندنی بی
۴۴ - ۲۶ ...	تارا بابی
۵۶ - ۴۵ ...	پتا
۷۷ - ۵۸ ...	سجوستا
۹۳ - ۷۷ ...	پدمنی
۱۰۶ - ۹۴ ...	ایہیہ بابی



(ب)

## تمہید

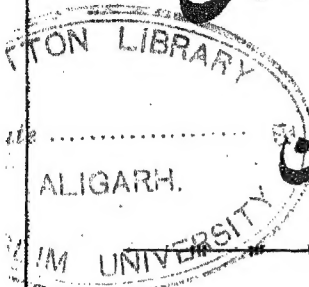
اس کتاب کی ترتیب تدوین میں جناب سٹر  
شرف الدین بی، بی، ٹی نے جو مدد دی ہے ایوان  
اشاعت اُس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔

انہوں نے ہندوستان کی مشہور اور مستند تاریخوں  
اور متعدد درسی کتابوں سے مواد فراہم کر کے ایوان اشاعت  
کو دئے۔ جنکو حذف و اضافہ اور ترمیم و تصحیح کے بعد اس صورت  
میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے طلبہ اور خواتین اس کتاب  
کو دلچسپی سے پڑھیں گی اور اس سے کما حقہ بہرہ مند ہوں گی

سکرٹری  
ایوان اشاعت  
گواکھپور

ہندوستان

بہادر عورتیں



(۱)  
رانی دُرگاوٹی

دکن کے پہاڑی علاقوں میں ایک چھوٹی سی ریاست  
گوئڈوانہ تھی جسکی راجدھانی گڑھ تھی۔ زیادہ تر اُس میں راجپوتوں  
کی جفاکش اور بہادر قوم آباد تھی۔ راجہ دالپت سنگھ اُن کا سردار  
تھا۔ وہ بہادری میں کیتا تھا۔ رعایا بھی اُس کو بہت مانتی تھی  
اُس کی رانی دُرگاوٹی ایک مشہور راجپوت اجہ کی بیٹی تھی۔

گوٹڈوانہ ایک خود مختار ریاست تھی جس نے آج تک بھی  
 کسی کا لوہا نہ مانا تھا۔ راجہ بھی منوجی کے قدم بقدم چلتا تھا۔  
 وہ دور اندیشی و انصاف کا پتلا تھا۔ رعایا آسودہ اور خوشحال  
 تھی۔ لوگ مختلف پیشوں پر بسر وقات کرتے تھے۔ ملک میں کوئی  
 فتنہ تھا نہ کوئی فساد۔ ہر طرح امن و امان تھا۔ چین اور سکھ کی نیند  
 سوتے اور اپنا کام آزادی کے ساتھ انجام دیتے۔ فلک بھر قمار  
 چین اور سکھ دیکھا نہ گیا۔ راجہ والپت سنگھ کو عین شباب میں موت  
 کے ظالم ہاتھوں نے رعایا سے جدا کر دیا۔ بیچاری دُرگا ونی بیوہ  
 ہو گئی۔ اُس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا، جس کا نام وینارائن  
 تھا۔ محض ملک و بچہ کی خاطر دُرگا ونی کو سستی کے خیال سے  
 باز رہنا پڑا۔ وہ مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ راج چاٹ کا  
 کام دیکھنے لگی۔ لوگ اب واپت سنگھ کے زمانہ کو بھول گئے،  
 اور رانی دُرگا ونی کے گیت گانے لگے۔

سولہویں صدی آدھی سے زیادہ مدت چلی تھی۔ دہلی کے  
تخت پر اکبر اعظم رونق افروز تھا۔ ہندوستان میں چاروں طرف فتح  
کا نعرہ بلند تھا۔ مقبوضات میں ضافہ ہو رہا تھا۔ اکبر کی نظر گوندوانہ  
پر بھی پڑی جس کی مالک ایک عورت تھی۔ اکبر کا سپاہی لار  
اصف خاں کچھ کم حوصلہ والا نہ تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ گوندوانہ  
کو زیر کر کے لے گا۔

مُغلوں کے حملہ کی خبر مل گوندوانہ کے کانوں میں پڑی۔ خبر  
کا ہے کہ کتنی ایک لگ تھی جو پل مالے تے ٹکا کے چپے چپے میں پھیل گئی  
لوگوں کو کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہونگے۔  
وہ نہ تو کسی بڑی سلطنت سے لڑتے بھڑتے تھے اور نہ خوں خیزی کو اچھا  
سمجھتے تھے۔ امن کی زندگی تھی۔ کسی سے کوئی شکر کار نہ تھا۔ مُغلوں  
کے حملہ کی خبر نے سب کو سراسیمہ کر دیا۔ حیران تھے کہ ہم کتنی بھرا چو  
مُغلوں کی بے شمار فوج کا کیونکر مقابلہ کریں گے۔ وہ ناامید و ردِ شکستہ



تو ہوا ہے تھے مگر ہمت اور قومی جوش میں کمی نہ تھی۔  
 انھوں نے عہد کر لیا کہ ملک کی بھینٹ چڑھ جانا ذلت اور  
 غلامی کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ رانی دُرگاوتی نے دل بڑھا  
 اور کہا "بہادرو! جب تک اچوتی خون رگوں میں لہریں لے رہا  
 ہے کروں جھکانا تو درکنار اسکا خیال کرنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔  
 تم بھی مرٹو مگر غور مغلوں کے آگے ہتھیار نہ ڈالو۔" انجام جو کچھ بھی  
 ہو دُرگاوتی نے مقابلہ کی ٹھان لی تھی، اور اپنے سوراؤں کی  
 ثابت قدمی اور جوانمردی سے مٹھن تھی۔ جیوں ہی مسلح ہو جانے کا  
 حکم رعایا کو ملا وہ جوش میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کے نوجوان کھڑے  
 اور سر کو ہتھیلی پر لے کر لڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھوڑے عرصہ  
 کے بعد فوج تیار ہو گئی۔ عورتیں اور بچے بھی اس مہم میں کسی سے  
 پیچھے نہ رہے۔ دوش بدوش میدان جنگ میں لڑنے کے لئے  
 آمادہ تھے۔ دُرگاوتی سپہ سالار بنی اور میدان میں مغلوں کا انتظا

کرنے لگی۔ اُن لوگوں کے دلوں میں یہ بات سما چکی تھی کہ ظالم  
مُغلوں کے حملہ کو ہم ضرور روک لیں گے اور اپنے ملک اور اپنی  
آزادی پر حرف نہ آنے دیں گے۔ ہر شخص اپنی بہادری کا جوہر  
دکھانے کے لئے بے چین تھا۔

آصف خاں مُغلوں کا سپہ سالار تھا۔ وہ اس خیال میں  
تھا کہ بھلا عورت ذات اُسکے سامنے کیا ٹھہریگی۔ چھوٹی سی  
سلطنت بلا کارزار کے ہاتھ آجائے گی۔ جب مقابلہ کی ٹھہری تو  
مُغلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بہادر راجپوت مقابلہ کے لئے  
شمشیر تول رہے تھے۔ اپنے زعم میں آصف خاں فوج بھی زیادہ  
نہ لایا تھا۔ ایک مختصر سالہ تھا جو اب آنکھ کھلنے پر محض کافی  
نظر آنے لگا۔

آخردہلی سے فوج طلب کی گئی۔ آصف خاں نے اس  
اتنا میں ایک شخص کو کچھ پیغام دیکر رانی کے پاس بھیجا۔ پیامبر

سانے بلایا گیا تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”غیرت دار اور شریف  
 رانی! میں آصف خاں کی طرف سے آیا ہوں، وہ اکبر اعظم کی فوج  
 کا سپہ سالار ہے۔ یہ پیام گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ مغل نہ تو لڑنے  
 کے لئے تیار ہیں اور نہ آپ کو نقصان پہنچانے کی نیت سے آئے  
 ہیں۔ ہاں اتنا چاہتے ہیں کہ اپنے لڑکے کو شہنشاہ کے سپرد دیجئے  
 اور اُسے اپنا مہاراج تسلیم کر لیجئے پھر ساری فوج واپس چلی جائیگی  
 اور آپ کا راج پاٹ برقرار رہے گا۔“

قبل اسکے کہ سپاہبرائینا آخری جملہ تمام کرے درگاوتی غصہ  
 میں کانپتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور کڑک کر بولی ”اپنے سردار سے  
 کلمہ و خیال بھی دل میں نہ لائے کہ ہم راجپوت مغلوں کی فوج کو  
 دیکھ کر ڈجائینگے۔ سامنے میدان جنگ ہے اب ہیں فیصلہ ہوگا کہ ہم  
 اکبر کو شہنشاہ تسلیم کریں گے یا آزاد رہیں گے۔“ یہ کہہ کر سپاہبر کو  
 دربار سے رخصت کر دیا۔

آصف خاں کو یہ جواب سُکر حیرت ہوئی اُسے کیا معلوم  
 تھا کہ رانی اپنی مختصر فوج لیکر مُغلوں کے لشکرِ عظیم کا مقابلہ کرنے  
 پر تُل جائیگی۔ دہلی سے فوج آگئی تھی مُغلوں نے گڑھ کی طرف  
 قدم بڑھائے۔ راجپوت بھی آگے بڑھے مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں  
 طرف تلواریں چلنے لگیں۔ رانی کے جسم پر بے کی زرہ چمک رہی  
 تھی۔ سر پر جو ڈھتی جسکی جھلک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ تلوار ہاتھ  
 میں تھی اور ایک سفید گھوڑے پر سوار تھی۔ آصف خاں اپنی کوڑھک  
 دنگ ہ گیا اُسکے ہر وار پر اسکی زبان سے بے ساختہ واہ نکل  
 جاتی تھی۔ سوار اور پیادل دونوں طرف رانی میں گتھے گئے۔ رانی بھی  
 تلوار سوت کر کو دھڑی، آفا فانا نہ جانے کتنے مُغلوں کو تلوار کے  
 گھاٹ اُتار دیا۔ اُسے دیکھ کر راجپوتوں کا دل بڑھتا رہتا، مگر مُغل  
 کانپ کانپ اُٹھتے تھے۔ وہ رہ رہ کر نعرہ لگا رہی تھی۔ ”میرے  
 بہادر سپاہیو! بڑھو! بڑھو! اپنی عزت اپنے ملک کے لئے تلوار

٨  
 پھلاؤ! پیدل اور سوار دونوں کامیاب ہیں۔ کوئی حملہ کر دکتا  
 تو کوئی تو اڑھلا تا جلد ہی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا مغلوں کے قدم  
 اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان راجپوتوں کے ہاتھ  
 رہا۔ دُرگاہوتی نے زہ اور خود اُتار کر دُرگادیوی کے آگے سجدہ  
 شکر ادا کیا اور اپنے محل میں چلی گئی۔

آصف خاں کی غیرت کیسے گوارا کرتی کہ عورت کے ہار پر چین  
 بیٹھ رہتا۔ یہ شکست اس کے لٹے ڈوب منے کی بات تھی۔ اس سے  
 بڑھ کر اسکی رُسوائی کیا ہو سکتی تھی کہ ایک عورت نے اسکو نیچا دکھایا۔  
 وہ سوچتا تھا اور رائے غیرت اور غصہ کے جھنجاہا تھا۔ اُس نے  
 پھر ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کیا اور دُرگاہوتی کے شہر پر چڑھائی  
 کی۔ رانی بھی غافل نہ تھی، پہلے ہی سے یہ دُرگاہو تھا۔ اُس نے  
 بھی اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور دشمن کے مقابلہ پر آگئی۔ اس شبہ  
 لڑائی اور بھی زیادہ گھسان رہی۔ تمام دن کُشت و خون ہوتا رہا

دونوں طرف مائے اور مرنے پر تلے ہوئے تھے مگر راجپوتوں کی  
سرفروشی اور دُرگاوتی کی بہتے مغلوں کے قدم ہلائے۔ وہ  
جس طرح آئے تھے اُسی طرح پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

آصف خاں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا، اُس کا دل ڈوبا جا رہا تھا  
مگر دُرگاوتی کے بھی بُرے دن آئے تھے۔ جو کام تلوار سے نہ ہوا  
وہ مکر اور فریب کے ذریعہ انجام پا گیا۔ مغلوں کو دوسری مرتبہ شکست  
دینے کے بعد راجپوت فتح کی خوشیاں منا رہے تھے، شہر میں چراغا  
ہو رہا تھا۔ دُرگاوتی نے دل کھول کر انعام تقسیم کیا۔ لیکن جانے  
وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جبکہ اُس نے اپنے لڑکے ویزارائن کو  
فوج کا افسر بنا دیا۔ بس کیا تھا۔ کچھ راجپوت بدظن ہو گئے۔ اُن کے  
سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ کہنے لگے کہ رانی نے  
خود غرضی سے کام لیا ہے۔ اب ہاتھ سے فادار اور جاں نثار  
راجپوت نہ تھے۔ حسد اور غصہ نے انکی عقل پر پردہ ڈال دیا۔ انھوں نے

مُغلوں کو خفیہ خطوط بھیجے کہ دُرگاونی کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے، آؤ اور ملک پر حملہ کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔  
 آصف خاں تو خُدا سے چاہتا تھا کہ کسی طرح کلنک کا ٹیکا اپنی پیشانی سے دور کرے فوج لیکر قلعہ پر چڑھ آیا، اور اُنکی دُرگاونی کے اقبال نے اُسکا ساتھ نہیں دیا۔

نگہبان نے خطرہ سے جیوں ہی رانی کو آگاہ کیا، اُس نے زور اور خود پہنی اور میدان جنگ میں اکھڑی ہو گئی۔ فوج دو حصوں تقسیم کی گئی۔ ایک ستہ کی سپہ سالاری اپنے بیٹے کے سپرد کی اور دوسرے کو خود اپنی سرکردگی میں رکھا۔ مگر حسد اور غداری کا بُرا ہو۔ لڑائی کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا گیا۔ آخر کار جاں باز راجپوتوں اتنا دم نہ رہا کہ مغلوں سے جم کر لڑتے۔ اُنھوں نے دُرگاونی کو سمجھا یا کہ اب مقابلے کا رہے یہ تھیار ڈال دینا ہی بہتر ہوگا۔ مگر رانی نے ایک نئے سنی۔ وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ جھپٹ کر

وار کر رہی تھی اور اپنے چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر لگا رہی  
 تھی۔ اسی میں ولی عہد کو ایک ایسا زخم کاری لگا کہ وہ جاں ہر  
 نہ ہو سکا۔ ماں کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ غم اور غصہ میں ہوش نہ  
 ہو اس کھوٹے بیچ لشکر میں گھس گئی۔ اب جو سامنے آتا تھا وہ  
 تلوار کی نذر ہو جاتا تھا۔ مغلوں کے قدم اکھڑنے والے ہی تھے کہ  
 دشمن کا ایک تیرا کر اُسکی آنکھ میں بیٹھ گیا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ  
 تیر نکال کر پھینکے، مگر ایک سپاہی نے پک کر بھالا اُسکے سینے  
 کے پار کر دیا۔ رانی دُرگاوتی تسنن نہ سکی۔ گونڈوانہ کی بہادر رانی  
 زمین پر آ رہی۔ دُرگاوتی نے ملک اور قوم کے لئے اپنے کو قربان  
 کر دیا اور تاریخ کے صفحات میں اپنی جاں نثاری کی داستان  
 چھوڑ گئی۔ اُس کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔





(۲)

## چاندنی بی

چاندنی بی سلطانہ نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی تھی وہ ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوئی۔ ابھی بالکل کمسن تھی کہ اُسکی تربیت شروع ہو گئی اور اچھے بُرے کی تعلیم دی جانے لگی۔ پاک باطنی اور سچائی کا سبق اُسکے دل میں نقش کر دیا گیا۔ چاندنی بی اپنی پیدائش کے بعد ہی ماں کی آغوش سے محروم ہو چکی تھی۔ سلطان نے اُسکی پرورش کی۔ اپنی چھیتی بیوی کی یاد اُسی لڑکی سے تازہ کر لیا کرتا۔ چاند سلطانہ مرحومہ ماں کی زندہ شبیہ تھی۔ سلطان کی اس سے بہت کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔ بیٹی ہر وقت باپ ہی کی صحبت میں رہتی۔ اور فی الحقیقت باپ ہی کی گود میں چاند سلطانہ نے حکومت کرنا سیکھا۔ چاند سلطانہ نے صورت بھی

بڑی دلکش پائی تھی۔ اُسکی معصوم اور خوبصورت آنکھیں، اُسکا  
 مہتابی رنگ، اُسکا پیارا قد، بس یہی چاہتا تھا کہ دیکھتے رہے۔  
 سیکڑوں شہزادوں نے شادی کے پیغام بھیجے، مگر ملک  
 کی مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر نظام شاہ نے علی عادل شاہ کو  
 چنا۔ اور چاند سلطانہ کی شادی اُسکے ساتھ قرار پا گئی۔ عوام  
 کا خیال تھا کہ یہ رشتہ دو سلطنتوں کو ایک کرنے کا۔ پھر اتفاقاً  
 ایک جہتی کے ساتھ مغلوں کی روک تھام ہو گئی۔

علی عادل شاہ بیوی کو بے حد چاہتا تھا۔ اُسکی کسی خواہش  
 کو رو نہ کرتا تھا۔ سلطنت کے کاروبار پر چاند سلطانہ کی ذہانت  
 فہم اور اُسکی دوراندیشی کا بڑا اثر پڑا۔ اس سے پہلے امراء اپنا  
 سارا وقت جنگ و جدل میں ضائع کرتے۔ اب ان میں صلح اور  
 محبت کا مادہ پیدا ہو گیا۔ جو دولت قرار بازی اور سیر و شکار  
 میں اُڑتی تھی وہ رعایا کی بہبود کے لئے صرف ہونے لگی۔ مسیح پر

جو دیران ہو گئی تھیں نمازیوں سے پھر آباد ہو گئیں غریبوں اور  
 یتیموں میں خیرات تقسیم ہونے لگی۔ عدل و انصاف کا یہ عالم  
 تھا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ لیکن کسی کے دل  
 سے ایک سے نہیں رہتے۔ زمانہ کی گردش کا کوئی اعتبار نہیں  
 بیجا پور کی بربادی کے دن بھی آگئے۔ موت کے بے رحم پنجوں نے  
 بیجا پور والوں سے اُنکے والی علی عادل شاہ کو چھین لیا۔  
 شہداء میں چاند سلطانہ کا سہاگ لٹ گیا۔ گو وہیں کوئی  
 بچہ بھی نہ تھا جس سے اُسکے دل کو ڈھارس ہوتی۔ اُمراء کی  
 دست درازیوں کا کوئی روکنے والا نہ رہا تو اُنھوں نے بھی خانہ جنگی  
 شروع کر دی۔

چاند سلطانہ نے کچھ عرصہ تک حتی المقدور رنج و غم کو  
 روکا۔ مگر کہاں تک؟ عورت ذات تھی، کچھ بس نہ چلا۔ زمانہ  
 کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرحوم سلطان کے کم سن بھتیجے ایراہیم کو

گو دیکھی لے لیا اور اُسکی طرف سے سارا انتظام کرنے لگی مگر نہ  
 ناموافق تھی۔ کامیابی مطلق نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں گو لکنتہ  
 بیدار۔ اور دوسری قرب جوار کی ریاستوں نے سر اٹھایا۔  
 بیجا پور کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھانے کے خیال سے چاند  
 سلطانہ پر چاروں طرف سے دھاوے ہونے لگے۔ رعایا میں امن  
 اور یکجہتی پیدا کرنے کے لئے چاند سلطانہ نے ایک پُر جوش تقریر  
 کی اور اہل بیجا پور کی غیرت، حمیت اور وطن پرستی کے جذبات  
 کو کچھ ایسا ابھارا کہ لوگ آپس کی بھڑک کو بالائے طاق رکھ کر دشمن  
 کے مقابلہ پر نکل گئے۔ اُس نے اُن کو نفاق کے بُرے نتیجے سمجھا  
 اور کہا کہ دشمن دروازہ پر کھڑا ہے۔ تم خواب غفلت سے بیدار  
 نہ ہوئے تو بیجا پور دوسری سلطنتوں کے زیرِ نگیں ہو جائے گا۔  
 یہی سہی وہ آزادی جو تھیں زندگی سے زیادہ عزیز ہے دشمنوں  
 کے ہاتھوں میں چلی جائیگی۔ پھر ہاتھ ملے رہ جاؤ گے۔ اٹھو اور

آزادی کے لئے مرٹو۔“

چاند بی بی کی تقریر رائگاں نہ گئی۔ اُس میں بلبکا جادو  
 تھا، سب اپنے آپس کے جھگڑے بھول گئے۔ اور چاند بی بی  
 کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے، سب نے ایک ہو کر زور لگایا اور  
 دشمن کو نیچا دکھا دیا۔ دُنیا پر ثابت ہو گیا کہ اتفاق سب سے بڑی  
 قوت ہے۔“ تھوڑے ہی دنوں بعد قسمت نے پھر بلٹا کھایا۔ آپس کے  
 جھگڑے پھر چھڑ گئے، ملک میں تبری پھیل گئی۔ اُسی زمانے میں  
 نوجوان ابراہیم نے بھی جو سن شعور کو پہنچ چکا تھا پیٹ سے  
 پائوں نکالے۔ وہ لوگوں کے زہریلے مشوروں کا شکار ہو گیا۔  
 اور چاند بی بی کے خلاف سر اٹھایا۔ خون کے آنسو روتی ہوئی  
 چاند بی بی نے احمد نگر کی راہ لی۔ احمد نگر اسکی جائے ولادت  
 تھی۔ مگر وہاں بھی چین کا ٹھکانا نہ ملا۔  
 بد قسمتی نے چاند بی بی کا ساتھ احمد نگر میں بھی نہ چھوڑا۔

جس اطمینان اور بے فکری کی تلاش میں وہ احمد نگر گئی تھی وہ  
 وہاں بھی مفقود تھی۔ خانہ جنگی کا دور دورہ وہاں بھی تھا۔  
 حسین شاہ کا جانشین اسکا بیٹا مرتضیٰ ہوا وہ بھی تلوار  
 کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سلطنت کا شیرازہ کچھنا شروع ہو گیا  
 دوسرا تخت نشین برہان نے ملک کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو  
 سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ مگر وہ بھی چند ہی دنوں  
 کی کامیاب حکومت کے بعد موت کے منہ کا نوالہ ہو گیا۔ حسین  
 کے دوسرے لڑکے کی قسمت کا فیصلہ بھی یوں ہی ہوا۔  
 اب اسکا شیر غوار بچہ ابراہیم تخت و تاج کا حقدار قرار پایا۔  
 لیکن اسکا بھی وہی حشر ہوا۔ چاند بی بی سے ملک کی  
 ابتری دیکھی نہ گئی جھٹ شاہی خاندان کے ایک نسل کو  
 تخت نشین کر دیا۔ اور خود سلطنت کے کاروبار کی دیکھ بھال شروع  
 کر دی۔ اس نے اس ہانت اور مستعدی سے اچھے نئے معاملات

سُجھا یا کہ لوگ لوہا مان گئے۔ سلطنت کا کام اس خوش سلیبی  
 سے انجام دیا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ملک میں  
 امن و صلح کا ڈنکا بجنے لگا۔ لوگ چین کی نیند سونے لگے۔  
 ہر طرح کی شورش دب گئی۔ مگر بعض اُمراء تھے جو چاندنی بی سے  
 جلتے تھے۔ اُنکے دل صاف نہ تھے۔ وہی چاندنی بی کے حسن  
 انتظام میں رخنے ڈال رہے تھے، اُنکی تعداد زبردست تھی۔  
 چاندنی بی کے روکے کبُتے تھے۔ اُنھوں نے غداری کی  
 مُغل شہنشاہ اکبر کو خفیہ خطوط بھیجے۔ اور احمد نگر پر چڑھائی  
 کرنے کی دعوت دی۔

اکبر تو اس تاک میں بیٹھا ہی تھا کہ موقع ملے اور سلطنت کو  
 دکن کی طرف بڑھائے خط کا پانا تھا کہ حملہ کی تیاری شروع کر دی  
 شہزادہ مُراد پٹھی دل فوج لیکر احمد نگر پر ٹوٹ پڑا۔  
 چاندنی بی بھی شجاعت میں کم نہ تھی۔ صورت تو عورت کی

ضرور تھی۔ گردل و دماغ میں کسی مرد سے کم نہ تھی۔ مقابلہ میں بڑے  
 بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ایک طرف وہ اگر صلح پسند  
 حکمراں تھی تو دوسری طرف بہادر اور جنگجو سپاہی بھی تھی۔ پہلے  
 تو اُس نے نمک حرام و غابازوں کا کام تمام کیا۔ پھر حملہ و کنے کی  
 تدبیریں کرنے لگی۔ اُس نے دل شکستہ درباریوں کو مخاطب کر کے  
 کہا۔ ”آزادی پر فدا ہو جانے والو! اٹھو، آپس کے نفاق کو بالکل  
 طاق رکھ دو۔ ملک کی حفاظت تمہارا فرض ہو۔ تیار ہو جاؤ۔  
 دشمن تمہیں دھمکیاں دے رہا ہے۔ ایسا نہ ہو ان کے سامنے تم ذلیل  
 و حقیر ثابت ہو۔“ مختصر سی تقریریں نہ جانے کیا اثر تھا کہ سب کے ہاتھ  
 شمشیر کے قبضہ پر چا پڑے۔ سب نے قسم کھائی کہ مرکز بھی دشمن کو  
 پیٹھ نہ دکھائیں گے۔ چاند سلطانہ نے والی بیجا پور سے مدد  
 کی درخواست کی اور ملک مانگی۔ قلعہ کے اندر سامان رسد کافی  
 جمع کر لیا۔ اور پھر شاہزادہ مراد کو پیغام بھیجا۔ ”اگر دوستانہ تعلقاً



قائم رکھنا منظور ہے تو تم کو سر پر بٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن  
 اگر لڑائی مقصود ہے تو اس سے ہم لوگ مُنہ نہ موڑیں گے۔ اگر  
 اور مرنے پر تیار ہوئے ہیں۔ جب تک جسم میں خون کا ایک قطرہ  
 ہے سر نہ چاہئے ہوگا۔ ”مراد ایسی دھکیوں کو کہ خاطر میں لانے والا  
 تھا اُسکو تو شہنشاہ اکبر کی خوشنودی مد نظر تھی، احمد نگر پر قبضہ  
 کرنا اصل مقصد تھا۔ مع اپنے لشکر عظیم کے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔  
 چاندنی بی نے ایسی صورت میں کیا کیا ہوگا؟ عورت  
 تو تھی ہی قلعہ بند کر کے بیٹھ رہی ہوگی؟ مگر نہیں! اُس نے ایسا  
 نہیں کیا۔ اُس نے ہتھیار باندھے۔ خود ناکے ناکے کا معاملہ  
 کیا۔ اور جو لوگ اُنکی محافظت پر تعینات تھے اُن کو مشورے  
 دے کر میدان جنگ میں آئی۔ جہاں دیکھتی کہ گھمسان لڑائی  
 ہو رہی ہے وہیں چاندنی بی آدمیوں کا دل بڑھانے کیلئے  
 آموچو دھوتی۔ آدمیوں کا دل بڑھ جاتا اور وہ جوش میں آتے

ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے۔ قلعہ کی دیواروں میں ادھر شرفکاف ہوا  
 ادھر اسکی مرمت ہوتی۔ احمد نگر کے عرب تیر انداز اپنے فن میں کامل  
 تھے۔ مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے۔

شہزادہ مراد اس زعم میں تھا کہ عورت ذات بھلا کیا مقال  
 کریگی۔ مگر چاند بی بی کی بہادری اور سپہمگری نے اُسکے حواس  
 ٹھکانے کر دیے۔ چاند بی بی نے بڑے بڑے سپاہیوں کے کان  
 کاٹ لئے۔ اب چاند بی بی کے سپاہیوں کو بھوک اور پیاس  
 ستانے لگی۔ بہت سے توبے جا چکے تھے، اور مغلوں کو کامیابی  
 کی اُمید نظر آنے لگی تھی۔ دیوار میں بھی سوراخ ہو گیا تھا۔ چاند  
 بی بی عین اُس موقع پر پہنچی جب سپاہیوں کی شکستہ ہو کر میدان  
 چھوڑنے کا قصد کر رہے تھے۔ اُسے خطروں اور دقتوں کا احساس  
 ضرور تھا۔ مگر اُس نے جرأت کر کے سپاہیوں کو لٹکھارا۔ بہادر و  
 میرے ملکی بھائیو! خوب دل کھول کر لڑے۔ شاباش! مگر کیا استفادہ

غول ریزی اور سفر و شہی کے بعد تم دشمنوں کے سامنے ہتھیار  
 ڈال دو گے؟ تقدیر کو پٹا کھاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ زمانہ کانگ  
 ایک ایک پل بدلتا رہتا ہے۔ آج سامنے ہم کو شکست کی  
 منحوس صورت دکھائی دے رہی ہے۔ کل کامیابی ہماری گود  
 میں ہوگی۔ ذرا عادل شاہی اور نظام شاہی زمانوں کو تو یا  
 کرو۔ سب کچھ ہاتھ سے نکل گئے مگر آج تک گردن نہیں ٹھکلی۔  
 وہ بھی کوئی انسان ہے جس کو اپنے وطن اور ہم وطنوں سے  
 محبت نہ ہو۔ آزادی اور ناموس کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو جانا  
 بہتر ہے۔ تم میں کون ایسا بُردل اور بے غیرت ہے جو دشمنوں  
 کی غلامی قبول کرے گا؟ خیر تھا راجواب جو کچھ بھی ہو میرا جواب  
 سُن لو۔ میں ہوں تو عورت مگر کیا مجال میٹھل مجھے اپنا غلام  
 بنالیں۔ تم سب میرا ساتھ چھوڑ دو۔ میں تنہا مقابلہ کروں گی۔  
 یہ کہتے ہوئے چاندنی بی قلیٹ کر میں گھس ٹپری، اور

ہیبت ناک ”کالی“ کی طرح تلوار ہاتھ میں لیکر سر قلم کرنے لگی۔  
 دشمنوں کا صفایا یوں ہونے لگا جس طرح کسان ہری بھری  
 کھیتی کو کاٹتے ہیں۔ چاند بی بی کی تقریر سے متاثر ہو کر اُسکے  
 سپاہی پل پل پڑے اور ایسا جہم کر پڑے کہ مغلوں کے پتے پانی  
 کرتے۔

مُراد پہلے سے چاند بی بی کی دلیری کا اندازہ نہ کر سکا  
 تھا۔ اب اُس پر اس عورت کا رعب چھا گیا، اُس نے فیصلہ  
 کر لیا کہ جب تک چاند سلطانہ سپاہیوں کے ساتھ ہوا احمد نگر  
 کا فتح کر لینا دشوار ہے۔ احمد نگر محفوظ رہا۔ مُراد نے صلاح  
 مشورہ کر کے چاند بی بی سے صلح کی درخواست کی۔ چاند بی بی  
 مُراد کے سپاہیوں کی کمزوری کو سمجھ رہی تھی۔ اُس نے فوراً  
 صلح منظور کر لی۔

۱۷۔ کالی ایک رکشش ہے جو فتنہ و فساد برپا کرتا رہتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد غداروں نے پھر ایک نیا شگوفہ کھلایا۔ پھر  
 اکبر کو خطوط بھیجے جانے لگے۔ اس مرتبہ چند نکاح حرام و بارہیل  
 نے اکبر کو میدان جنگ میں خود آنے کی ترغیب دی۔ وہ  
 آیا۔ اور چاندنی بی کی سرکردگی میں احمد نگر کے مغلوں کا  
 مقابلہ کیا۔ اور خوب کیا۔ ہمت اور مردانگی دیکھو کہ چاند  
 نی بی دست بدست لڑ رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بارہو  
 اور گولیان ختم ہو گئیں تو اُس نے بندو قوں میں چاندنی سونے  
 کے زیورات اور سکے بھڑا شروع کئے۔ اکبر غور سے کارزار  
 کا رنگ دیکھتا رہا۔ چاندنی بی کی شجاعت دل میں گھر  
 کر چکی تھی۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ لڑائی بند کی جائے۔  
 ایسی بہادر عورت کی دوستی باعث فخر ہے۔ اُس نے فوراً  
 چاند سلطانہ کو سلامی دی۔ اور صلح کی خواہش ظاہر کی۔  
 چاند سلطانہ خود بھی تھک چکی تھی، چاہتی تھی کہ کشت و خون

بازار اب بند ہو۔ اُس سے اپنے آدمیوں کا لڑ لڑ کر مرنا دیکھا  
 نہ جاتا تھا۔ اُس نے اکبر کی درخواست منظور کر لی۔ لیکن یہ  
 اُس کے لئے آخر میں خطرناک زہر ثابت ہوا۔ اُس کے سپاہی موقع  
 اور مصلحت کو نہ سمجھ سکے۔ وہ اس خیال میں تھے کہ فتح ہمارے  
 ہاتھ ہے اور اکبر کی فوج کے قدم بس اب اُکھڑنا ہی چاہتے ہیں  
 کہ لتے میں اُن کو ہاتھ روک دینے کا حکم ہوا۔ وہ غصہ سے مریج  
 و تاب کھانے لگے۔ اُن کو طرح طرح کی بدگمانیاں ہونے لگیں  
 چاند سلطانہ کے دشمن تو تاک میں تھے ہی یہ افواہ اڑادی  
 کہ چاند سلطانہ نے خود ہی مغلوں کو احمد نگر میں داخل ہونے  
 کی اجازت دی ہے۔

چاند بی بی جنگ کو بند کر کے اپنی خلوت میں بیٹھی ہوئی  
 تھی کہ یکایک بدول اور بدگمان فوج کے سپاہی اُس میں ٹپس  
 آئے اور شریف اور دلیر چاند بی بی کو جو بھی ابھی میدان جنگ

میں دوش بدوش اُن کے ساتھ تھی۔ اور اپنے جوش و استقلال  
سے اُن کا دل بڑھا رہی تھی قتل کر دیا۔

یہ تھا چاند بی بی کا حسرت ناک انجام۔ اُسکے کارنامے  
تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے اور ہر زمانے میں اُس کا نام احترام  
اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے گا۔



(۳)

## تارا بابی

تارا بابی کا شمار اُن عورتوں میں ہے جنہوں نے اپنے ذاتی نام و نامور اور فلاح و بہبود کے لئے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں۔ اُس نے نہ ملک کی کوئی خدمت کی اور نہ قوم کے لئے کچھ گنایا۔ پڑھنے والوں کا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تارا بابی نے جو کچھ کیا وہ اپنے بیٹے کے لئے کیا، اور اس لئے اُس کا نام ہندوستان کی جانباز عورتوں کی فہرست میں نہ ہونا چاہئے۔ لیکن جس رزمیہ اور سوجھ بوجھ کیساتھ اُس نے اپنا کام کیا۔ اور جس دلیرنی استعداد کا ثبوت دیا اُس کو دیکھتے ہوئے تارا بابی کا شمار ملک کی نامور عورتوں میں نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

تارا بابی ایک مرہٹہ سردار تھیں راکھی بیٹی اور سیوا جی کے



دوسرے بیٹے راجہ رام کی بیوی تھی۔ علاوہ تارابی کے  
 راجہ رام کی کئی اور بیویاں بھی تھیں۔ جہانگی بانی تو مرچکی  
 تھی۔ مگر راجس بانی اور امبکا بانی، تارابی کی شادی  
 کے وقت زندہ تھیں۔ چند سال بعد اُس سے ایک لڑکا پیدا  
 ہوا جس کا نام اُسکے مشہور دادا کے نام پر شیواجی رکھا گیا  
 یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مرہٹے مغلوں سے لڑ رہے تھے۔ اس جنگ  
 آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں کو اورنگ زیب کے مقابلہ میں  
 شکست ہوئی۔ راجہ رام دکن کی طرف بھاگا۔ اور جہنچی میں  
 پناہ لی۔ جب کچھ اطمینان ہوا تو اُس نے اپنی رانی تارابی کو  
 بھی وہیں بلوا بھیجا۔ کانکن کے کنارہ دھرے ہوئے تارابی  
 مع اپنے ساتھیوں کے پانڈیکپری پہنچی۔ راجس بانی کے  
 بھی ایک بیٹا تھا اُس کا نام سمبھاجی تھا۔ اور وہ ۱۶۹۳ء  
 میں پیدا ہوا تھا۔ امبکا بانی سے بیٹی ہوئی تھی جو کم سنی ہی میں

ماں کی گود خالی کر گئی تھی۔ مغللوں نے چنچلی کو بھی گھیر لیا۔ مگر اُس کے قابض نہ ہو سکے۔ راجہ رام بھاگ کر ہمارا ستر پہنچا اور وہاں مغللوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ مگر روز کی ٹرائی اور روز کے اندیشوں نے اُسکی تندرستی میں گھٹن لگا دیا۔ آخر کار سنہ ۱۷۷۷ء میں دُنیا سے کوچ کر گیا۔

راجہ رام، سیواجی کا چھوٹا بیٹا تھا۔ سا ہو جو دراصل وارث تھا مغللوں کی قید میں تھا۔ راجہ رام محض اُسکا قائم مقام تھا۔ اب یہ سوال درپیش ہوا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو سیواجی جو تارابانی سے تھا۔ اور دوسرا سمبھاجی جو امبیکا بانی کے پیٹ سے تھا۔ دونوں پنڈالائیں مقیم تھے۔ امبیکا بانی تو شوگر کی بخش کے ساتھ سستی ہو گئی تھی۔ رہ گئی تارابانی، اُس نے اپنے کام میں دیر نہیں کی۔ درباریوں سے کہا کہ ”سیواجی کو اپنا بیٹا تسلیم کرو۔“ چند نمک حلال درباریوں کو غدر ہوا۔ اُنھوں نے کہا

کہا "ساہو کی غیر موجودگی میں تم خود اسکی نیابت کر سکتی ہو۔  
 بیٹے کو گدھی پر بٹھانے کا تم کو کیا حق ہے؟" رانی یہ سن کر آگ بگولا  
 ہو گئی۔ اُن درباریوں کو توقید خانہ میں ڈال دیا، اور دوسروں کی  
 مدد سے سیوہاجی کی رسم تاج پوشی دھوم دھام سے ادا کی۔ سیوہاجی  
 ستائیس برس میں تخت نشین ہوا۔ اُسی زمانہ میں بھوانی بانی کے ساتھ  
 اسکی شادی رچانی گئی۔ تارا بانی نے بڑی دوراندیشی سے کام  
 لیا اور راجس بانی اور اُسکے بیٹے سمبھاجی کو قید کر دیا۔  
 اب تارا بانی اس قابل تھی کہ مغلوں کا سامنا کر سکے۔ تارا  
 بانی اپنے بہادر باپ کے سائے جنگی ہتھکنڈوں سے واقف تھی۔ حیرت  
 و دلیری، جفاکشی اور حسرتی و چالاک کی تو اُسکو ترکہ میں ملی تھی۔ ایک  
 خیمہ سے دوسرے خیمہ اور ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ تک ہوا  
 باتیں کرتی ہوئی جاتی تھی۔ تھکنڈا تو گویا جانتی ہی نہ تھی۔ اسوقت  
 اسکی زندگی ایک معمولی سپاہی کی زندگی تھی۔ دن ہو تو پتہ نہ تھے

سُوج کی کوئی پروا نہیں۔ رات ہے تو زمین پر پڑے ہیں کوئی  
 عار نہیں۔ جہاں دیکھو تارا بابی موجود، ہر وقت تازہ جنگ کی  
 تیاریوں میں مصروف۔ درباریوں اور سپاہیوں پر اسکی بہادری اور  
 مستعدی کی دھاک بیٹھ گئی۔

اورنگ زیب کو کبھی خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ تارا بابی  
 اپنے دُھن کی ایسی کٹی نکلے گی۔ عورت ذات اور غلوں سے مقابلہ  
 کیسی بے تک بات تھی؟ آخر کار اُسے بھی داؤں بیچ نکالے۔  
 اُس نے ساہو کو مجبور کیا کہ وہ مختلف مرہٹہ سرداروں کو خط لکھ کر  
 اُن سے حلف لے کہ وہ غلوں کا ساتھ دیں گے۔ غرض صرف یہ تھی  
 کہ مرہٹہ سرداروں میں پھوٹ کا بیج پڑ جائے۔ ساہو خود مرہٹوں  
 کو راہ پر لگانے کے لئے روانہ ہوا۔ تارا بابی کو بیٹے کی حکومت  
 سنبھالنے میں بے حد رحمت اُٹھانا پڑی۔

شیواجی غبی اور کمزور تھا۔ اب اسکی بائی نے بھی اپنے

بیٹے سمجھا جی کی خاطر تاج و تخت کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ خانہ  
 جنگیاں چھڑنا ہی چاہتی تھیں کہ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ساہو  
 سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ ادھر تارا بانی کے ہوا خواہوں  
 نے دامن سمیٹا اور ایک ایک کر کے ساہو کی طرف ہو گئے۔ مگر  
 تارا بانی نے پیشانی پر پل نہ آنے دیا۔ اُس نے اب یہ خبر اڑادی  
 کہ اصلی ساہو تو زندہ ہی نہیں رہا۔ اُسکو تو مرے عرصہ ہوا۔ اپنے  
 آدمیوں سے کہا کہ دودھ اور ابلتے ہوئے چاول پر قسم کھاؤ اور  
 وعدہ کرو کہ جیتے جی میرے بیٹے کا ساتھ نہ چھوڑو گے۔ اُن میں چند  
 ہی لوگوں نے تارا بانی کے کہنے پر عمل کیا اور قسم کھائی۔ بہتیرے  
 تو یہ کہہ کر اُٹے کہ ساہو کے دنیا سے چل بٹنے کا کوئی ثبوت نہیں  
 اس بنا پر میں ساہو بھی نہیں مٹا کرے گا، لوگوں سے دوستی  
 پیدا کرے گا، مارا پیٹا چلا آ رہا تھا۔ اسکے ساتھ یوں آدمیوں کی کافی تعداد  
 تھی اور مرہٹہ سردار بھی اُسکا ساتھ دیتے کا حتمی وعدہ کر چکے تھے۔

سا ہو قلعہ پر قلعہ فتح کرتا آخر کار پنہالا میں داخل ہو گیا۔ تارا  
 بانی وہاں سے رنگنا بھاگی۔ پنہالا فتح ہو چکا تو سا ہونے  
 رنگنا کی سمت باگ موڑی۔ رنگنا کی قلعہ بندی معمولی نہیں تھی  
 سا ہونا کام رہا۔ زور تو ایڑی چوٹی کا لگایا، مگر قسمت میں فتح تو  
 تھی نہیں۔ قلعہ ہاتھ آتا تو کیونکر مجبور اپنا سا مٹھ لیکر لپٹ آیا  
 پھر کیا تھا، تارا بانی کی قسمت کا ستارہ ایک مرتبہ پھر چمک اٹھا  
 اُسکی مُردہ اُمیدوں میں جان پڑ گئی، اور یہاں تک لڑھا کہ  
 پنہالا پر دھاوا مارا اور بات کی بات میں قبضہ کر لیا۔ اُس نے  
 قلعہ کے سپاہیوں کو رشوت دے کر اپنا بنا لیا۔ پھر تو اسکے استے  
 میں کوئی کاٹنا نہ رہا۔ ادھر سے اطمینان کر کے کوٹھیا پور کا رخ  
 کیا، اور اُسکو مرہٹہ سلطنت کا پایہ تخت قرار دیا۔ وہاں سے چاروں  
 طرف گماشتے دوڑا دے۔ اُنکا کام لوگوں کو سا ہو کے خلاف  
 بہکانا تھا۔

تارا بابی کا مقصد تو فقط اتنا تھا کہ وہ لوگ جو ساہو کے تھے  
 ہو گئے تھے یا تو خود مختار اور آزاد ہو جائیں، یا مغلوں کے ساتھ ہو  
 رہیں۔ اکثر مرہٹہ سرداروں نے یہی کیا کہ وہ یا تو خود مختار ہو گئے  
 یا انعام و اکرام کے لالچ میں مغل شہنشاہ کے طرفدار ہو گئے۔ اس  
 طرح ایک عورت کی جاں توڑ کوششوں نے ساہو کی ساری  
 امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کہاں دو سال پیشتر اتنا عروج ہوا کہ  
 ساہو کی قسمت کا ستارہ اوج کمال پر چمکتا نظر آ رہا تھا۔ یا اب  
 زوال آیا تو ایسا کہ لے دے کر ایک ستارہ کا خطہ اُس کے قبضہ میں  
 رہ گیا تھا۔ یا پھر اطراف کے چند چھوٹے چھوٹے پہاڑی قلعے جو  
 وفادار افسروں کے ہاتھ میں تھے۔

وہی بات میں تارا بابی کی قسمت پھر پٹ گئی۔ اس کو قتل  
 کی خوبی کہنے یا زمانہ کا انقلاب شکر زائیں جو بہادری میں کھتا  
 تھا۔ اور دنیا جس کی جواں مردی کا گیت گاتی تھی، اب تک

تارا بانی کا خیر خواہ اور طرفدار تھا، اُس کو اب تک راقین تھا  
 کہ اصلی سا ہونزدہ نہیں ہے جب یہ راز کھل گیا کہ تارا بانی نے  
 سب کو دھوکا دے رکھا ہے تو اُس نے اسکا ساتھ چھوڑ دیا۔ ساہو  
 کار وزیر اور اُسکا خاص شیر بالاچی و شونا تھا ذات کا برہمن تھا  
 وہ بڑا فسادی تھا۔ اُس نے سازشوں کا جال پھیلا کر شروع  
 کر دیا۔ وہ خوب بھتا تھا کہ جب تک تارا بانی کو ٹھاپور میں  
 ساہوکی دال گنا محال ہے۔ اُس نے راجہ رام کی بیوہ جیس  
 بانی کو پیغام بھیجا کہ ”اگر تم تارا بانی اور اُسکے بیٹے کو کسی طرح رک  
 دے دو تو میں ساہوکی طرف سے تمھاری مدد کا وعدہ کرتا ہوں۔“  
 راجہ بانی نے اس پیغام کو اپنی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا۔ فوراً  
 اکرہمت باندھ کر گھڑی ہو گئی۔ ساتھ میں کو ٹھاپور کے اُمرا  
 کی مدد سے پنہالا کے محافظوں کو کچھ دلا کر اپنی طرف کر لیا۔  
 تارا بانی کی ساری حکومت خاک میں مل گئی۔ اپنی حوصلہ مندی کا



ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا دے سکتی تھی کہ اُس نے تارا بانی  
اور اُسکے بیٹے شیواجی کو قید خانہ میں جھونک دیا، اور اپنے بیٹے  
سمبھاجی کو گدی پر بٹھا دیا۔

راجس بانی اور سمبھاجی کو کچھ زیادہ دن عیش و  
جشن منانا نصیب نہ ہوا۔ سا ہو تو گھات لگائے موقع کا  
منتظر تھا ہی۔ فوراً اپنے آدمیوں کو تعینات کیا۔ وہ یکایک  
سمبھاجی پر ٹوٹ پڑے۔ بیچارہ کو بھاگتے ہی بنی۔ اب جس  
بانی اور تارا بانی دونوں اُنکے بس میں تھیں، اُنھوں نے  
دونوں کو سا ہو کے پاس ستارا بھیج دیا۔ سا ہونے بڑی تعظیم  
کے ساتھ اپنی دونوں بدخواہ ماؤں کا استقبال کیا۔ وہ اُن کو  
پہنا لائیں عزت و آبرو کے ساتھ نظر بند رکھنا چاہتا تھا۔  
تارا بانی کو راجس بانی سے کچھ ایسی کہ تھی کہ اُسکے ساتھ قید خانہ  
میں بھی رہنا گوارا نہ کیا۔ اُس نے سا ہو سے کہا: "میں ستارا

اسی میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ ساہو نے منظور کر لیا۔ اُسکے لئے  
 قلعہ میں ایک محل تعمیر کرا دیا۔ جس میں تارا بانی نے ساہو کے  
 مرنے تک زندگی بسر کی۔

ساہو لا ولد مرا۔ تارا بانی کے بے ہوئے حوصلے ایک تبتہ  
 پھرا بھرے۔ قسمت آزمائی کے لئے تیار ہو گئی۔ ساہو کا لا ولد  
 مرجا نا کچھ اچھا نہ ہوا۔ وہ سمجھا جی سے مُطلق خوش نہ تھا۔ اگر  
 تارا بانی کا لڑکا سیدو اچی ہوتا تو اُسے ضرور اپنا وارث قرار دیتا  
 مگر موت اُسکا بھی کام تمام کر چکی تھی۔ ساہو کی بیوی سگ کو بانی  
 ذرا تند مزاج تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ ساہو کسی گود لے اور اُسی  
 کو اپنا وارث بنائے۔ اُسے بالاجی و شونا تھ سے بھی عداوت  
 تھی۔ اُسکے خلاف اُس نے ساہو کے کان بھرا شروع کر دیے۔  
 چاہتی تھی کہ بہرین کو ملازم سے علیحدہ کر دیا جائے۔ ساہو بھی کبھی  
 گود لینا ہی چاہتا تھا کہ تارا بانی کو خبر لگ گئی۔ بڑھاپے نے اسکے

حوصلوں کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اُس نے جاں لبباجہ سے ملاقات  
 کی اجازت طلب کی۔ اور سرہانے آکر بہت کچھ اونچا نیچا سمجھا کر  
 کہا کہ ایک اجنبی کو گودے کر گدی پر بٹھا دینا خلاف مصلحت ہے  
 ابھی تو ایک نارت سلامت ہے۔ گدی اُسے کیوں نہ ملے؟ سا ہو بخیر  
 سمجھا جی کے اور تو کسی حقدار کو جانتا نہ تھا۔ اُس نے حیرت سے پوچھا  
 وہ کون؟ مارا بانی نے جواب دیا کہ اُسکے بیٹے سیواجی کی بیوی  
 بھوانی بانی سے ایک بیٹا ہے۔ جو شوہر کے مرنے کے بعد پیدا  
 ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں اُس نے ایک عجیب قصہ بھی بیان کیا۔ وہ  
 یہ تھا کہ سباداراجسن بانی، بھوانی بانی کے بیٹے سے کوئی بدسلوکی  
 کر بیٹھے مارا بانی نے بچہ کو افیون کھلا دی تھی۔ اُس پر ایسی گہری نیند  
 طاری ہوئی کہ لوگ اُسے مردہ سمجھنے لگے۔ اسکے بعد اُس نے اسکا  
 جنازہ بھی نکالا۔ اور بجائے بچے کے دو مرغلوں کو دفن کر دیا۔ یہ سب  
 بچہ کو راجسن بانی کے بچہ سے بچانے کے لئے کیا گیا تھا۔ سا ہو کو

تارا بانی نے پورا یقین دلایا کہ وہ بچہ رام راجہ دورا چوتوں کی  
 آغوشِ محبت میں پل رہا ہے۔ سا ہوتا رابی کا بڑا احترام  
 کرتا تھا۔ اُس نے اسکو جھوٹا تو نہیں سمجھا۔ مگر اپنی حیرت دور  
 کرنے کی غرض سے پوچھا "اسکا کوئی ثبوت بھی پیش کر سکتی ہو؟"  
 تارا بانی کسی کام کو ادھر ادھر اچھوڑنے والی نہ تھی۔ فوراً راجپوتوں  
 کو لا کر کھڑا کر دیا۔ اُنھوں نے تصدیق کی کہ تارا بانی کا بیان  
 حرف بحرف صحیح ہے۔ پھر تو ساہو کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی  
 اُس نے طے کر لیا کہ رام راجہ ہی راج پاٹ کا مالک ہوگا۔  
 سکور بانی اور ہی خواب یکہ رہی تھی۔ اُسکی نظر  
 ایک ایسے لڑکے پر تھی جو کمزور اور زمالا لائق تھا حکومت کی  
 قابلیت اُس میں بالکل نہ تھی۔ سکور بانی کو پوری اُمید تھی  
 کہ اُس لڑکے کی تحت نشینی سے اُسکا اپنا اقتدار بڑھ جائیگا۔  
 حکومت کی باگ ڈور اُسکے ہاتھ میں ہوگی۔ اپنی اُمیدوں کو

اس طرح پامال ہوتے دیکھا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس  
 جا کر سا ہو سے کہا کہ تھیں سیدھا سا دا سمجھ کر یہ چال چلی گئی  
 ہے۔ سا ہونے اپنے پیشوا بالاجی کو خفیہ ہدایت دے رکھی تھی  
 کہ میرے مرنے کے بعد رام راجہ کے سوا کوئی تخت پر قدم نہ  
 رکھے۔ اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ محل کی نگرانی فوج کے سپرد کی جائے  
 تاکہ سکور بانی یا سمبھاجی، رام راجہ کے راستہ میں کسی قسم  
 کی رکاوٹ نہ پیدا کرنے پائیں۔ یہ وصیت کر کے سا ہو ہری  
 ہری، شیو، کتراسو جگ کو سدھارا۔ ادھر سا ہو کا دم ٹوٹا۔  
 ادھر پیشوائے آدمیوں کو اُس کے جانشین رام راجہ کو لانے  
 کے لئے بھیجا۔ اُسے تو تخت پر بٹھایا، اور سکور بانی کو شوہر کی  
 جانے کے لئے مجبور کیا۔ بالاجی و شو ناتھ یہ چاہتا تھا کہ  
 سلطنت کا مالک خود بن جائے، اور رام راجہ اُس کے ہاتھ میں  
 محض کٹھ پتلی بنا ہے۔ اُس نے رام راجہ سے کہا کہ آپ

ابھی بچہ ہیں، چھین سے سونے کے دن ہیں۔ پینسٹھ لاکھ سالانہ  
جید خراج قبول فرمائیے اور اجازت دے دیجئے کہ میں تارا بانی  
کے ساتھ ہو کر سلطنت کا کاروبار دیکھوں۔ آپ ستارا میں جہاں  
چاہیں آئیں جائیں۔

رام راجہ کو یہ صلاح پسند آئی۔ مگر تارا بانی کب ماننے  
والی تھی۔ اُس نے جیوں ہی سنا جل کر خاک ہو گئی۔ وہ ماڑ گئی  
کہ میرا نام صرف اپنی غرض کے لئے پیشوانے شامل کر لیا ہے  
اپنی جگہ پر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ پوتا تو بڑے نام بادشاہ ہوگا۔  
اصلی حکمران میں ہو گئی۔ مگر اب اُسکی اُمیدیں خاک میں مل رہی  
تھیں۔ فوراً بالاجی کی مکاری کا جواب سوچ نکالا۔ اُس نے یہ  
خواہش ظاہر کی کہ میں سنہاگڈھ جاؤں گی، اور اپنی زندگی کے  
باقی دن اپنے شوہر رام راجہ کی قبر پر گزاروں گی۔ تا جوشی  
کے دو ماہ بعد تارا بانی قلعہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

سنہا گڈھ کا حاکم چمناجی ایک بہادر سپاہی تھا۔ تارا  
 بانی کا داؤں اُس پر چل گیا۔ حاکم نے پیشوا کو نیچا دکھانے اور نوجوان  
 رام راجہ کو اُسکے پنجے سے چھڑانے کا بیڑا اٹھالیا۔ بالاجی پہلے  
 ہی تاڑ گیا تھا کہ تارا بانی کا سنہا گڈھ جانا مصلحت سے خالی  
 نہیں ہے۔ جیوں ہی اس ساز باز کی خبر پائی اُس نے چمناجی  
 اور تارا بانی کو دربار میں طلب کیا، اور دھمکا یا کہ اگر آئے میں ذرا  
 بھی تامل کیا تو سخت سزائیں بھگتنا ہونگی۔ دونوں باغیوں کے  
 ہاتھ کے طولے اڑ گئے۔ مگر اب کہہ ہی کیا سکتے تھے؟۔ ناچار حکم  
 کی تعمیل کرنا پڑی۔ بالاجی بھی بڑا چالاک و رفتین تھا۔ اُس نے  
 تارا بانی کی بڑی خاطر مدارات کی۔ نذرانہ پیش کیا۔ اور پھر  
 عزت اور عظیم کے ساتھ ستارا بھیج دیا۔ اس طرح اُس نے تارا بانی  
 کو چمناجی سے جدا کر دیا۔ اور چمناجی کو قید خانہ میں جھنک دیا  
 لوگ سمجھتے ہوئے کہ تارا بانی نے ہار مان لی۔ مگر ایسا نہیں

اپنی کھوئی ہوئی حکومت کے حاصل کرنے کی دھن اُسے اب بھی  
 تھی۔ وہ تدبیریں سوچا کرتی تھی۔ اور ایک لمحہ کے لئے غافل نہ  
 رہتی تھی۔ اُسکا آخری فیصلہ یہ تھا کہ چاہے کچھ ہوا اب امراجم  
 ہی کو قید کر لینا چاہئے۔ پھر امرا اور اراکین دربار کی مدد سے پیشوا  
 کو سر کرنا اتنا دشوار نہ ہوگا۔ اُس نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط  
 سے اپنی تدبیروں کو عمل میں لانا شروع کیا۔ شیوجی کا مندر  
 ستار اسکے قلعہ کے اندر تھا۔ اُسکے درشن کے بہانے اندر جانیکی  
 اجازت مانگی۔ افسروں اور سپاہیوں کو رشوتیں دیں۔ ہتھیار اکٹھا  
 کئے، اور رام راجہ کا انتظار کرنے لگی جب وہ آپس آیا اُسکے پاس  
 یہ کہلا بھیجا۔ تمہاری دادی تھیں دیکھنے کے لئے بتیابے، ایک  
 دن کے لئے کھڑے کھڑے اُسکے پاس بھی ہو جاؤ۔ رام راجہ کے  
 فرشتوں کو بھی نہیں خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ خبر ہوتی کیسے؟  
 یہی دادی تھی جس نے اُسے تخت و تاج دلوا یا تھا۔ رام راجہ قلعہ میں



داخل ہوا۔ وادی نے محبت بھرے لہجہ میں داخل ہوا۔ وادی نے محبت بھرے لہجہ میں خوش آمدید کہا۔ ادھر جاں بچھائے جا رہے تھے۔ ادھر نوجوان راجہ شراب کباب میں لگ گیا۔ کھاپی کر فارغ ہوا تو وادی سے رخصت ہو کر گھوڑے پر سوار ہوا قلعہ کے پھاٹک پر پہنچا تو دیکھا کہ در بند ہیں۔ دیکھتے دیکھتے تارابی کے سواروں نے اُسکو گھیر لیا۔ اور اُسکو قید میں لے لیا۔ سواروں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اب راجہ کا شور و غل سب سے سو دھڑکا۔

سپاہیوں نے اس سے ہتھیار لے لئے اور تارابیک قید خانہ ڈال دیا جہاں سے پھر وہ زندہ نہ نکلا۔ تارابی نے اپنے پوتے کو جیتے جی اسی کال کوٹھری میں رکھا۔ پیشوا کی قوت اس عرصہ میں جڑ پکڑتی گئی۔ اُسکا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ کسی نے اس طرف توجہ نہ کی کہ بدقسمت ام راجہ قید خانہ میں ایسی بے بسی و بے بسی کی موت مر رہا ہے۔

(۴)

## پینا

آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس پہلے چتوڑ  
 میں ایک راجہ تھا۔ جو رانا سنگ ام سنگھ کا پوتا تھا۔ او  
 بکرماجیت کے نام سے مشہور تھا۔ رعایا اُس سے راضی  
 نہ تھی۔ وہ نہایت بد ذات اور بد مزاج تھا۔ دربار کے  
 ذمی حیثیت اور باوقار امراء کی اُس کی نظروں میں کوئی  
 وقعت نہ تھی۔ اور اُمرا بھی وہ جو بڑے بڑے بادشاہوں  
 کی نظر میں معزز و ممتاز تھے۔ بکرماجیت کو اپنا سارا تو  
 سپاہیوں اور پہلوانوں کی صحبت میں ضایع کرنے کی  
 لت تھی۔ سلطنت کے کاروبار سے اُس کو کوئی سروکار نہ تھا  
 کھیل کود کا شید تھا۔ اور کسی بات سے مطلب نہ غرض۔

بہادر شاہ گجرات کا فرماں روا تھا بیٹھے بٹھائے چتور  
 پر آدھمکا اور چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا۔ وہ تو کو  
 خوش قسمتی سے سوتیلی ماں رانی کرنا و تھی اُس کی پشت  
 پناہ بن گئی۔ اُس نے مغل شہنشاہ ہمایوں کی خدمت  
 میں درخواست بھیجی کہ ”آئیے اور ایک دُکھیا کی داد دے  
 فرمائیے۔ ملک کو دشمنوں کے پنجہ سے نجات دلوائیے۔  
 ہمایوں بڑا رحم دل تھا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھتا تو  
 دل بھرتا۔ راجپوت شریف زادی کی درخواست نے  
 اُس کے دل پر بڑا اثر کیا۔ وہ لشکر عظیم کے ساتھ بہادر  
 شاہ کی سرکوبی کے لئے آموجود ہوا۔ اور اس کو محاصرہ  
 اٹھالینے پر مجبور کیا۔ رانا بیکراجیت اب چین سے راج  
 کرنے لگا۔ مگر اپنی مصیبتوں اور بد بختیوں سے کوئی سبق  
 نہ لیا۔ سلطنت کی طرف سے وہی بے پروائی۔ اُمرا کے ساتھ

دہی بدسلوکی۔ ایک مرتبہ تو غضب ہی ڈھا دیا۔ کرم چند  
 اجسیر کا ایک بہادر سپاہی تھا۔ دربار میں اُس سے کوئی  
 غلطی ہو گئی بکراجیت اُسے مار ہی تو بیٹھا۔ پھر کیا تھا؟  
 راجپوتوں کا خون کھول گیا۔ سب بگڑ گھڑے ہوئے اور  
 ایک دل اور ایک رے ہو کر اُس سے راج پاٹ چھین  
 لیا۔ اب پرتھوی راج کے لڑکے بن بیر کے سر پر تاج پہکا  
 گیا۔ اور تہسمت بکراجیت کو عبرت حاصل کرنے لئے  
 لئے قید خانہ میں ڈال دیا۔

بکراجیت کا حقیقی جانشین رانی کرناو تھی کا بیٹا  
 اُدے سنگھ تھا۔ جو ابھی بہت کم سن تھا۔ آپس کی پھوٹ  
 چتور کو غارت کر رہی تھی۔ ساری ریاست تنکا بوٹی ہو کر  
 رہ گئی تھی۔ درباریوں کو اندیشہ تھا کہ ایسی صورت میں  
 ایک بچہ کو تخت پر بٹھانا نہ جانے اور کیا کیا تباہیاں لائیگا

اسی مصلحت سے بن سیر کو سلطنت کا تخت قیاج سوئپ  
 دیا گیا۔ رانی کرناوتھی مر رہی تھی وہ اپنے گود کے بچہ کو پیتا  
 دانی کے سپرد کر کے دُنیا سے چل بسی۔ اور یہ اُمید دُنیا سے  
 اپنے ساتھ لیتی گئی کہ اگر جی مر کے میرا نو نہال بچا تو ممکن ہے  
 ایک دن چتور کا تاج اُسکی پیشانی پر چکے۔

پیتا تھی تو دایہ مگر وفا کی پتلی تھی۔ پیتا کے معنے  
 ”ہیرا“ کے ہیں۔ وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس نام سے  
 پکاری جائے۔ اُس نے دُنیا سے رخصت ہوتی، انی سے  
 وعدہ کیا تھا کہ ”نہیے شانہ رائے کو اپنی اور اپنے دُلا روں کی  
 جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔ ہر طرح کی مصیبت جھیل  
 لوں گی مگر امانت میں خیانت نہ ہونے دوں گی۔ اُدے سنگھ  
 پر کسی قسم کی آچ نہ آنے پائے گی۔“

پیتا کے بھی ایک بچہ تھا، جو اُدے سنگھ کا ہم سن تھا۔

پتا دونوں شیرخواروں کی پرورش ساتھ ساتھ کرتی تھی  
 اُدے سنگھ جیوں جیوں پروان چڑھتا گیا طاقت اور  
 خوبصورتی بھی بڑھتی گئی۔ دایہ اکثر پرانے زمانہ کے بہادر  
 کی کہانیاں اُس کو سُنانی اور اُن کی ہمت دلیری کے گیت  
 گا گا کر اُس کے جوش کو ابھارتی۔ اُدے سنگھ بزرگوں کے  
 کارنامے سُن کر بہت خوش ہوتا۔ رام اُس اور جہا بھارت  
 کی کہانیاں بڑے شوق سے سُنتا تھا۔ ایک دن جبکہ پتا  
 بچوں کو کھلا رہی تھی ایک نوکر اُس کے پاس ڈرتا ہوا  
 آیا۔ پریشانی اُس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اُس نے  
 آتے ہی کہا۔ ”پتا! بڑا غضب ہو گیا۔ بکرا جیت سنگھ  
 قتل کر دیا گیا۔“ پتا کچھ دیر تک سکھ میں رہی۔ وہ جانتی تھی  
 کہ بن بیردل کا کھوٹا ہے۔ وہ اصلی جانشین کی زندگی میں  
 اپنے کو محفوظ نہیں سمجھے گا۔ ڈری کہ بکرا جیت کے بعد

اُسے سنگھ کا کام تمام کرے گا۔ اور ہر مکن کانٹے کو  
 اپنی راہ سے دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے پل  
 بھر میں ایک تدبیر سوچ لی۔ مگر اُس پر عمل کرنا بڑی جرات  
 کا کام تھا۔ اُس نے اپنے بچہ کو شہزادہ اُسے سنگھ کا لباس  
 پہنایا اور شہزادہ کے بستر پر لٹا کر کہا بیٹا سو رہو آج  
 تم شہزادہ کی جگہ کام آؤ گے۔ بھولے بھالے نادان بچہ  
 کو کھپکھپک چھپک کر سلا دیا۔ اُسے سنگھ سے کہا تم کو  
 ایک عجیب ماشہ دکھانے لے چلیں گے۔ پھر اُسے مکان  
 کے ایک تاریک حصہ میں لے گئی۔ اور پھل کی ایک  
 بڑی سی ٹوکری میں اُسے بٹھا کر کہا کہ خبردار شور نہ مچانا۔  
 اس کے بعد اُس کو تپوں سے ڈھانک دیا اور ایک ملازم  
 سے کہا اُس کو قلعہ کے باہرے چلو۔ میں بھی وہیں سے  
 نکلتا ہوں۔

پتا اپنے محل میں آئی جہاں اُس کے جگر کا ٹکڑا شنراؤ  
 کے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ چند ہی لمحے گزے تھے کہ دروازہ  
 کھلنے کی آواز کانوں میں آئی، اور پل بھریں بن سیراٹھ  
 میں نیکی تلوار لے داخل ہوا۔ پتا اُسے دُر کے کانپنے لگی۔  
 بن بیر نے آتے ہی پوچھا: ”پتا! جلد بتاؤ دے سنگھ  
 کہاں ہے؟“ پتا غوب اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے  
 حواس میں نہ تھی۔ غم اور ہراس نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔  
 بول تو نہ سکی۔ اشارہ سے بتلا دیا کہ ”وہ سو رہا ہے“ بے رحم  
 اور ظالم بن سیراٹھ کے قریب آیا۔ تھوڑی دیر تک تو  
 اس بات کا اطمینان کرتا رہا کہ سونے والا اُسے سنگھ ہی ہے،  
 زرق برق لباس ہیرے اور جواہرات سے مُصنَع ٹوپی  
 اور لیشی بستر نے اُس کے سائے شبہ دور کر دیے  
 اُس نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا خنجر بے گناہ بچہ کے



سینہ کے پار کر دیا۔ اور غرض غرض اپنے محل کو چلا آیا کہ  
اب تخت و تاج کے لئے جھگڑا کرنے والا کوئی نہیں رہا  
اپنے خیال میں وہ سائے رقیبوں کا خاتمہ کر چکا تھا۔  
جیوں ہی بن بیر کرے سے نکلا۔ پتا لپک کر لپنگ کے  
قریب آئی اور اپنے بچہ کو چھاتی سے لگا لیا۔ جو کچھ پیش آیا سے  
پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اُس نے اپنا وعدہ خوب وفا کیا  
مگر ماں کی مامتا، کہاں تک ضبط کرتی؟ محبت نے جوش مارا  
آنسو اُمڈ آئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے اور  
چلانے کا شور بلند ہو کر محل کی اماؤں کے کانوں تک پہنچا  
دوڑ کر سب پتا کے گرد جمع ہو گئیں۔ سب نے پتا کے غم میں  
شرکت کی اور بڑی دیر تک بے گناہ بچہ کی لاش پر قائم کرتی  
رہیں۔ صرف پتا ہی کو علم تھا کہ شہزادہ اُسے سنگھ ظالم  
بن بیر کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ ہے۔ لوگ سوچ سوچ کر

رو رہے تھے کہ افسوس سنگ ام سنگھ کی نسل کا خاتمہ ہو گیا  
اُسے سنگھ کے قتل نے اُسکے خاندان کو ہمیشہ کے لئے  
نیست و نابود کر دیا۔ مقتول بچہ کا جسم شان و شوکت کے ساتھ  
آگ کی مذکریا گیا۔ جب بچہ کی راکھ پر پتیا خوب دل کھول کر  
آنسو بہا چکی تو اُٹھی اور جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی وفادار  
ملازم کے پاس پہنچی اور شہزادہ اُسے سنگھ کی دیکھ بھال  
میں لگ گئی۔

باوفا غلام چتور کے پچھم چند میل کے فاصلہ پر ایک دریا  
کے کنارے کھڑا تھا اور بے صبری کے ساتھ پنا کی راہ دیکھ رہا  
تھا۔ خوش قسمتی سے بچہ بھی اُس دن خوب سویا اور کوئی اُسکو  
دیکھ نہ سکا۔ اُنھوں نے دیولا کی راہ لی۔ سنگھ راؤ وہاں کا  
راجہ تھا۔ اُنھوں نے اُس سے درخواست کی کہ اُسے سنگھ  
کو اپنی پناہ میں لے لے۔ اُنھوں نے ہنس کر سمجھایا کہ سنگھ ام سنگھ

کے خاندان کا یہی ایک نام بیوا رہ گیا ہے۔ کسی طرح اس کی پرورش ہو جاتی تو اچھا تھا۔ مگر راجہ نے صاف انکار کر دیا۔ بات یہ تھی کہ وہ ڈرتا تھا کہ بن بیر کو معلوم ہوگا تو اچھی طرح خبر لے گا۔ پتہ نہایت ہارنے والی نہ تھی۔ سیدھے ڈونگر پور پہنچی۔ جب راجہ راول اسکرین کو پتہ کی کارگزاریوں کا علم ہوا تو اُس نے کہا "میں اس کو اپنی پناہ میں ضرور لے لیتا۔ مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں از کھل گیا تو میری اور شہزادہ دونوں کی جان پر آئینے گی۔" پتہ کی درخواست اس طرح یہاں بھی رد ہو گئی۔

ہر حالہ صاف جواب مل رہا تھا۔ پتہ مایوس ہو چلی تھی۔ مگر وہ مستقل مزاج عورت تھی۔ وہ ایسی کم ظرف اور کمزور دل والی عورت نہ تھی جیسا کہ راول اور راول تھے۔ وہ عورت ذات تو تھی۔ مگر جو ترانی اُس نے کی تھی وہ اُس کی جرات

اور بلند درجہ صِغریٰ کا کافی ثبوت تھی۔ وفاداری اور استقلال کو اپنی اور اپنے بچہ کی جان سے کہیں زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اُس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ارادل پہاڑ کی پیچ در پیچ وادیوں کو طے کرتی ہوئی میدان کے جنگلی باشندوں یعنی بھیلوں کی مدد سے وہ کوئل میر پہنچی اور فوراً وہاں کے حاکم کو پیغام بھیجا کہ میں آپ کے ملنا چاہتی ہوں۔ حاکم کا نام آسا ساہ تھا۔ وہ چینی تاجروں کے قبیلہ سے تھا اور بڑے خلیق اور خدا ترس تھا۔ جب پتا اُس کے سامنے آئی تو اُس نے شہزادے کو اُس کی گود میں ڈال دیا اور کہا ”اپنے بادشاہ کی جان کی حفاظت کیجئے۔“ اور پھر سارا ماجرا حرف بحرف کہہ سُنایا۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آنے والی تھی۔ کیونکہ آسا ساہ نے جب ساری باتیں سُنیں تو جو اس باختہ ہو گیا۔ قریب تھا کہ اپنی معذوری بیان کر کے اس بلا کو اپنے سر سے اُلٹا دے۔

کہ اُس کی ماں نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اُس نے کہا ”بیٹا! وفاداری اور صداقت میں خطروں و مشکلات کا ڈر کیسا؟ یہ شاہزادہ سنگ رام سنگھ کی یادگار ہے اور یہی تمھارا اصلی بادشاہ ہے۔ خدا چاہے گا تو انجام اچھا ہی ہوگا۔“

آسا ساہ اپنی بُزدلی اور بے حیلتی پر بہت نادم ہوا۔ بہادر ماں کے جوش بھرے الفاظ نے اُس کا دل بڑھا دیا۔ اُس نے شاہزادہ کو اپنی پناہ میں رکھنے کا وعدہ کر لیا۔ او لوگوں کی بیگمانی کو دور کرنے کی غرض سے مشہور کر دیا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔

پتا اپنے فرض سے سبک دوش ہو چکی تھی۔ اُس نے اب کوئل میرے رخصت ہونے کا قصد کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہاں ٹھہرنا لوگوں کے دلوں میں شک پیدا

کر دے گا۔ وہ وہاں سے چل دی۔ شاہزادہ جوں جوں ان  
 ہوتا گیا اُسکی صورت سے شاہانہ جلال ٹپکنے لگا۔ آخر کار راز فاش  
 ہو گیا اور دور و نزدیک یہ افواہ پھیل گئی کہ کوئل میرے عالم  
 کا بھتیجا دراصل اُسے سنگھ ہے۔ چتوڑ والوں کو جب خبر ہوئی تو  
 جان میں جان پر گئی۔ درباری اور امراء بن بیر کی حکومت سو  
 یوں ہی تنگ آ گئے تھے۔ وہ تو خدا سے چاہتے تھے کہ ان کے  
 سر سے یہ بلا ٹلے۔ لوگ اس خوشخبری کی تصدیق کیلئے چتوڑ  
 سے کوئل میر سپہ نچے۔ اور اپنے شاہزادے کو پہچان لیا۔ پتہ  
 بھی اپنے واقعات ان لوگوں کو سنائے۔ وہ اپنی قربانی اور  
 جاں فشانی کا پھل اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ  
 تھی۔ لوگ اُسے سنگھ کو چتوڑ لائے اور بڑی دھوم دھام سے  
 اُسکی تاج پوشی ہوئی۔

## (۵) سینھو گتا

بارہویں صدی میں ایک چھتری راجہ جس کا نام  
 انگ پال تھا دہلی میں راج کرتا تھا۔ وہ سارے ہندوستان  
 کا شہنشاہ تھا۔ خدا نے اُسے کوئی اولاد نہیں دی تھی  
 محض دو بیٹیاں تھیں جو دو بہادر راجپوت سرداریوں کو  
 منسوب تھیں۔ اُن میں ایک تو راتھور نسل سے تھا اور فوج  
 کا مالک تھا۔ دوسرا چوہان تھا اور اجمیر کا والی تھا۔  
 انگ پال کے جب کوئی بیٹا تھا ہی نہیں تو پھر تخت تاج  
 کا وارث کون ہوتا؟ ہاں اُس کی مرضی پر مختصر تھا۔ جس کو  
 راج پاٹ سونپ دے۔ اُسکی دونوں بیٹیوں سے دو بیٹے  
 تھے۔ جے چند را اور پریتھوی راج۔ جے چند را پہلی رُکی

سے تھا اور پرتھوی راج سے عمر میں چند سال بڑا بھی تھا۔  
 اُسے پوری اُمید تھی کہ تاج شاہی ایک روز میری پٹیا  
 پر چکنا ہوگا۔ لیکن قسمت کسی کی نوڈی نہیں۔ انگ پال کی  
 وصیت سے دہلی کے تخت و تاج کا مالک پرتھوی راج  
 ہوا اور جے چندر کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ پرتھوی  
 راج کا انتخاب موزوں بھی تھا۔ اُس میں شہریاری کی ساری  
 صفتیں موجود تھیں۔ اُسکی شریف النفسی، جرات، دلیری  
 اور اچھے اطوار نے شہنشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ غرض کہ  
 جب انگ پال عالم جاودانی کو سدھارا تو اُسکی جگہ  
 پرتھوی راج جلوہ افروز ہوا۔

جے چندر کو جب پرتھوی راج کے تخت نشین ہونے  
 کی خبر ہوئی تو وہ حسد کی آگ میں جل مرا۔ اُس کے غیظ و  
 غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسے کبھی یہ گمان بھی نہ ہوا



تھا کہ میں اس بُری طرح نظر انداز کر دیا جاؤں گا۔ بلکہ اس کا ظ  
سے کہ دونوں بھائیوں میں وہی بڑا تھا، اُسے یقین تھا کہ  
تخت شاہی میرے قدموں تلے ہوگا اور صد باج گزار  
سرداروں کی گردنیں میرے سامنے خم ہوں گی۔ اس قصہ  
نے اُس کے خیالی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور اُس کے  
ارمانوں کے قلعہ کو پل مارتے زمین پر گرادیا۔ وہ غصہ سے  
بُھن اُٹھا اور پرتھوی راج کو اپنے حقوق کا غاصب سمجھنے  
لگا۔ اُس نے پرتھوی راج سے انتقام لینے کی ٹھان لی  
محض موقع اور وقت کا انتظار تھا۔

دو ہندو سرداروں کی باہمی رقابت نے ہندوستان  
کو خاک میں ملا دیا۔ اُسی زمانہ میں ملک غور میں جہندوستان  
کے شمال اور مغرب میں واقع ہے ایک باہمت اور باجوا  
شخص جس کا نام شہاب الدین محمد غوری تھا برسرِ حکومت

تھا۔ اپنے پیشرو محمود غزنوی کی طرح اُس کے دل میں بھی یہ  
 متنا تھی کہ ہندوستان کو کوٹنا چاہئے۔ اور ممکن ہو تو ملک پہ  
 بھی قبضہ کرنا چاہئے۔ اب تک تو راجپوتوں کی دلیری نے  
 اُس کے حوصلہ کو پورا نہ ہونے دیا تھا۔ اُسے ”راٹھور“ اور ”چولان“  
 کی باہمی عداوت کی خبر ہو گئی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا؟ حالاً  
 اُس کے ہر طرح موافق تھے۔ اُس نے اتفاقاً ایک لشکر عظیم  
 تیار کر لیا۔ اور دریائے سندھ کو پار کر کے تھانیسر کے میدان  
 میں آدھمکا۔

غوری کے حملہ نے سارے ہندوستان کو بیدار کر دیا۔  
 تمام راجپوت بہادر اپنی اپنی مددگار فوجوں کو لے کر پتھوی  
 راج کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اُن کو خیال پیدا ہو گیا  
 تھا کہ ہمارا دھرم خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اور اس خیال کے  
 پیدا ہوتے ہی انہوں نے دھرم کی حمایت پر کمر باندھ لی۔

پر تھوڑی راج کم سن تھا مگر اُس کی ہمت اور لیاقت کا  
چاروں طرف ڈنک بج رہا تھا۔ وہی تمام فوجوں کا سردار  
بنایا گیا۔ اُس کے ماتحت تمام فوجیں غوری کے حملہ کو روکنے  
کے لئے تھانیسر کی طرف روانہ ہوئیں۔ ایک اکیلا بچہ چند  
تھا جو اُس مہم میں شرکت ہوا۔ وہ پر تھوڑی راج سے اتنا  
جلتا تھا کہ اُس نے اپنے حساندان کا ناموس بچانے کیلئے  
پر تھوڑی راج کا ساتھ نہیں دیا۔

تھانیسر کی جنگ جو راجپوتوں اور غوری کے  
ساتھیوں میں ہوئی صرف بارہ گھنٹہ تک جاری رہی۔  
ہر طرف ہمدردی اور جوان مردی کے جوہر دکھلائے جا رہے  
تھے۔ اس میں طرفین کی فوجوں نے نقصان عظیم برداشت  
کیا۔ نہ تو پٹھان ہی ہارنے نظر آتے تھے اور نہ راجپوت  
دیر تک مقابلہ برابر کا رہا۔ پٹھان جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔

غوری نے ٹھان لیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ہندوستان پر قبضہ ضرور ہوگا۔ راجپوت بھی اپنے ملک اور دھرم کی حمایت میں کچھ کم دلیری سے کام نہیں لے رہے تھے۔ آخر کار جب آفتاب غروب ہو گیا اور تاریکی چھانے لگی تو اس جنگ کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ فتح کا سہارا راجپوتوں کے سر رہا۔ غوری اُس کی فوج کو پسا ہوا پاڑا۔

فتح کی خبر سن کر سارے ہندوستان میں خوشی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ مگر جے چند رملول تھا۔ وہ اس وجہ سے نہیں کہ ہندوؤں کو فتح نصیب ہوئی، بلکہ اس وجہ سے کہ فتح پر تھوڑی لاج کے ہاتھوں ہوئی۔ پر تھوڑی لاج کی بہادری کی تعریف سنا تو اُس کے زخمی دل کو ٹھیس سی لگ گئی۔ اور بھانٹوں کا اُس کی منہ میں گیت گانا تو زخم پر نمک چھڑک رہا تھا۔ اُس کی اپنی لڑائی سنجوگتا کا اوروں کے

ساتھ جشن منانا اور پیغام فتح سنانے والے کو موتی کا ہار  
نذر کرنا کھولتے تیل پر پانی کا کام کر گیا۔ غرض کہ اُس کے غصہ  
کی آگ ہر طرح بھڑکتی ہی گئی۔

قنوج کے راجہ جے چندر کے صرف ایک بیٹی تھی  
نام اُس کا سنجوگتا تھا۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک  
ہندوستانی عورت میں ہونا چاہئے۔ چاند جو دربار کا شاعر  
تھا سنجوگتا کے حُسن کے گیت گایا کرتا تھا۔ جب تک نیا قائم  
ہے اُسکے حُسن و جمال کا چرچا ہوتا رہے گا۔ پرتھوی راج  
کی شرافت اور بہادری کا سنجوگتا کے دل پر کافی اثر ہو چکا  
تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا یہ وہ خوبیاں تھیں جو دل میں گھر کے  
بغیر نہیں رہ سکتیں۔ تھا نیسمر کہ میدان میں جس دن سے  
پرتھوی راج کو کامیابی نصیب ہوئی اُسی دن سے وہ  
سنجوگتا کے دل میں بس گیا۔ دن ہو یا رات سنجوگتا کے

دل میں پرتھوی راج کی یاد رہتی تھی۔ اُسکی تصویر ہر وقت  
 نظر کے سامنے رہتی تھی۔ اُسکی جانبازی اور دلیری کے  
 قصوں کے سوا کسی بات میں جی نہیں لگتا تھا۔ جے چند  
 نے سنجوگتا کو اس خیال سے باز رکھنے کی کیا کیا کوششیں  
 نہیں کیں۔ اُس نے ہر چند چاہا کہ لڑکی پرتھوی راج کی  
 محبت کو دل سے دور کر دے مگر ہر کوشش بیکار اور ہر  
 نصیحت اُگلاں ثابت ہوئی۔ اب وہ شادی کے قابل  
 تھی۔ جے چند کو مناسب برکی تلاش ہوئی۔ راجپوتوں  
 کے دستور کے مطابق اُس نے سوئمہر کا اعلان کیا۔ یہ  
 ایک رسم تھی جس میں ہندوستان کے تمام راجہ اکٹھا ہوتے  
 اور لڑکی ایک ہارے کرتام راجاؤں کے پاس سے ہوتی  
 ہوئی گزرتی تھی۔ جو راجہ اُسکو پسند ہوتا وہی اُس ہار کا  
 اہل ہوتا۔ لڑکی گلے میں ہار ڈال دیتی۔ اس طرح لڑکی اپنا

شوہر خود منتخب کر لیتی۔ ایک پر تھوڑی راج ہی ایسا راج  
 تھا جو سنجو گتا کے سوئمبر میں نہیں بلا یا گیا۔ اُسکی ذلت اور  
 توہین میں بے چند رنے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ پر تھوڑی  
 راج کی ایک مورت جو دیکھنے میں نہایت بد نما تھی صدر  
 دروازہ پر بجائے دربان کے نصب کرادی۔ یہ ایک ایسی توہین  
 تھی جو کسی طرح پر تھوڑی راج جیسے سو رما کے شایان تھی  
 پر تھوڑی راج کی ذلت اور توہین سے سنجو گتا کے دل  
 پر سخت چوٹ لگی۔ اُس کو بڑا صدمہ ہوا۔ سوئمبر بغیر پر تھوڑی  
 راج کے اُسکے لئے بیکار تھا۔ وہ اپنی جان، اپنا دل بہادر  
 پر تھوڑی راج کی نذر کر چکی تھی۔ بے چند ر سنجو گتا کے دل  
 کی اصلی حالت سے بخیر تھا۔ اور بیٹی کی محبت کو کڑھلی کے  
 اُبال سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ تو اس خیال میں کہ ادھر  
 سنجو گتا نے سوئمبر میں کسی شہزادے کو پسند کیا اور پھر پر تھوڑی راج

کی محبت دل سے رخصت ہوئی۔

سوئبر کا دن نزدیک ہوتا جا رہا تھا، شہزادوں اور  
امیروں کی آمد قنوج میں شروع ہو گئی۔ اُن کو مختلف محلوں  
میں ٹھہرایا گیا۔ مگر سنجو گتا کی کیا حالت تھی؟ اُس کا دل  
دھڑک رہا تھا۔ ”کیا ایک اجپوت کی لڑکی اپنے باپ کی  
خواہش پر اُس شخص کی محبت کو قربان کر دینے کے لئے تیار  
ہو گی جسے وہ اپنا دل کب کی سوئپ چکی ہو؟“ نہیں! او  
کبھی نہیں! وہ اپنے دل میں کہا کرتی ”میری محبت خواب  
خیال نہیں ثابت ہو گی۔ یہ کڑھی کا اُبال ہو کر نہ رہے گی۔  
میری محبت سچی محبت ہے جو میرے اوپر پرقومی راج کے  
درمیان ایک مضبوط زنجیر ہے۔ اپنا ستر تاج کسی اور کو  
منتخب کرنا درکنار اس کا خیال بھی دل میں لانا گناہ اور  
بدترین گناہ ہو گا۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اپنی جان سے ہاتھ



دھو بیٹھوں گی۔ مگر شادی کروں گی تو پر تھوی راج کے  
ساتھ اور کسی کے ساتھ نہیں۔ آخری تجویز اُس نے یہ سوچی  
کہ ایک قاصد چوہان کے سردار کے پاس اس پیغام کے ساتھ  
بھیجے کہ محبت کی حفاظت منظور ہے تو پر تھوی راج وقت  
پر مدد کے لئے آجائے اور سنجوگتا کو وہاں سے لے جائے۔  
انہار محبت کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ طریقہ  
تھا جس پر شہزادی رُکنی نے اپنے مالک کرشن سے انہار  
محبت کرنے کے وقت عمل کیا تھا۔

اس تجویز کے چند ہی منٹ بعد اُس نے ایک مُعتبر  
قاصد کو بلایا اور جو اُس نے لکھ رکھا تھا اُسکو حوالہ کر کے  
تاکید کی کہ جلد جاؤ۔ پر تھوی راج کو یہ خط دو اور جواب لاؤ  
قاصد صبار قرار گھوڑے پر سوار ہوا اسے باتیں کرتا ہوا پر تھوی  
راج کے پاس پہونچا اور ملاقات چاہی۔ پر تھوی نے اُسکو

اندرا بلالیا۔ قاصد نے امانت سپرد کی۔ پرتھوی راج نے  
خط کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔ ہر دفعہ آنسو اسکی آنکھوں میں  
چھلکنے لگتے جب سے خیال آتا کہ سچو گتا اسکی محبت میں کس قدر  
بے قرار ہے تو اسکا دل بھرتا جب وہ سوچے لگتا کہ شہزادی  
نے اپنی قسمت کا بیڑا بھینسا کیا ہے، اور اگر اُس نے  
پہنچنے میں دیر کی تو جان پر پھیل جائیگی، تو اُس کا جی سن سے  
ہو جاتا۔ پرتھوی راج نے جواب میں اتنا لکھ کر ہر کاسے کے حوالے  
کیا کہ ”دل شکستہ نہ ہو۔ یقین رکھو کہ پرتھوی راج تم سے غافل  
نہیں ہے اور نہ وقت پر تم اُسکو غافل پاؤ گی۔“

پیغام لانے والے کو تو اُس نے رخصت کر دیا۔ خود  
سب سے تیز گھوڑے پر سوار ہوا اور چوٹی کے سپاہیوں کو ساتھ  
لے کر قنوج کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھیک اُس وقت جبکہ  
آفتاب کی گلابی کرنیں آسمان کے مغربی اُفق پر اپنا رنگ چھا

رہی تھیں بہادر راجپوت سوار قنوج میں داخل ہوئے۔  
 اُن کو سوداگر کا بھیس اختیار کرنا پڑا تب شہر کے اندر گزر  
 ہوا۔ شہر میں داخل ہو کر سوئمہر محل کے قریب بیسے ڈال سکے۔  
 آخر وہ صبح بھی آئی جس دن مہمان راجاؤں کی قسمیوں  
 کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ لوگ سوئمہر کی تقریب میں جوق جوق  
 شہر کی گلیوں میں جمع ہونے لگے۔ بچے بھی کھیل کود بھول  
 گئے تھے اور سوئمہر محل کے قریب ٹھٹ لگائے ہوئے تھے  
 اُس روز شہر کی گلیاں ورمکانات دل کھول کر راستہ کئے  
 گئے تھے۔ خود سوئمہر محل کی رونق دیکھنے کے قابل تھی۔  
 شاہنہرادے وقت معینہ پر سوئمہر محل میں آ کر اپنی اپنی جگہ  
 پر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ ہر شاہنہرادہ کی یہ کوشش  
 تھی کہ وہ دوسروں سے لباس میں جُسن میں اور تمام خوبوں  
 میں شاہنہادی کی نگاہوں میں بڑھ جائے۔ ہر شاہنہرادہ کے

دل میں یہی حسرت تھی کہ شاہزادی اُسے پسند کر لیتی۔  
 خدا خدا کر کے انتظار اور بے چینی کی کٹھن گھڑیاں ختم ہوئیں۔  
 ہر طرف سے شور اٹھا کہ شاہزادی وہ آرہی ہے۔ "سبجو گتا  
 مع چند خواصوں کے زرق برق لباس میں سوئبر محل کے اندر  
 داخل ہوئی۔ اُسکے زریں لباس اور بیش بہا زیور اُس کے  
 حُسن خدا داد کو اور بھی چار چاند لگائے ہوئے تھے جس وقت  
 نازک اور خوبصورت ہاتھوں میں ہار لئے ہوئے وہ ایک  
 شاہزادے کے پاس سے ہوتی ہوئی دوسرے کے قریب  
 آتی اُس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور وہ دل میں دُعا  
 کرتا کہ کاش مجھ سے آگے قدم نہ بڑھاتی۔ مگر اُن میں سے کسی  
 کو بھی اس کا علم نہ تھا کہ سبجو گتا کے ہاتھ کا ہر کسی اور کی  
 گردن کو ڈھونڈ رہا ہے۔ سب کے سب مَنجُو تھے۔ سبجو گتا  
 جب کسی شاہزادے کے سامنے آ کر کھڑی ہوتی تو اُس کی

خادمہ اُسے تفصیل کے ساتھ شاہزادے کی بہادری کے  
کارنامے سناتی۔ اس طرح شاہزادی مُسکراتی ہوئی آخری  
شاہزادے کے قریب آئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ  
شاہزادہ بازی لے گیا۔ مگر لوگوں کی ٹکٹکی بندھی رہ گئی جب  
انہوں نے دیکھا کہ وہ شاہزادہ بھی اُن سے کچھ کم قیمت  
نہیں ہے۔ شاہزادی تھوڑی دیر ٹھٹھکی اور پھر ادھر ادھر  
نظر دوڑانے لگی۔ گویا وہ کسی اور کو تلاش کر رہی تھی۔

بے چند اور اُسکے مہانوں میں سے کسی کی سمجھ میں  
یہ بات نہ آئی کہ شاہزادی کا اصل منشا کیا ہے؟ وہ چاہتی  
کیا ہے؟ اُسے جستجو کس کی ہے؟ لیکن اُنکی یہ حیرت بہت  
جلد دور ہو گئی۔ شاہزادی ایک بیک صدر دروازہ کی  
طرف مڑی۔ اُسکی نگاہیں پرتھوی راج کی اُس مورت پر  
پڑ رہی تھیں جو اس وقت بے چند کے محل کی درباری کراچی

تھی۔ سنجوگتا نے تیزی کے ساتھ قدم اٹھایا۔ اور دیکھتے دیکھتے  
 ہار اسی مٹی کی مورت کے گلے میں تھا۔ ٹھیک اسی وقت  
 ایک نوجوان سوار جمع کو پیرتا پھاڑتا سامنے سے نمودار ہوا  
 اور پل مارتے سنجوگتا کو اپنی آغوش میں لے کر گھوڑے پر  
 بٹھایا۔ اور مع اپنے ہمراہیوں کے جو اُسکے پیچھے پیچھے تھے  
 گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا یہ جاوہ جانظر سے اوجھل ہو گیا۔  
 یہ بہادر نوجوان سوار پر تھوڑی راج کے اور کون ہو سکتا تھا؟  
 قنوج کے بہادر تلواریں تول کر آگے بڑھے۔ چاہتے تھے کہ اس  
 گستاخی کا مزار پر تھوڑی راج اور اُسکے ساتھیوں کو چکھا دیں  
 مگر اٹھوڑ بہادر بھی اُن کے مقابلے سے کب بھاگتے تھے۔  
 کھڑے ہو گئے۔ دونوں طرف سے تلواروں کے ہاتھ چلنے  
 لگے۔ مگر سانپ نکل چکا تھا۔ زمین پر لائٹی مارنا بیکا رہا تھا۔  
 پر تھوڑی راج سنجوگتا کو لے ہوئے یہاں پہنچ گیا۔

پورے ایک سال تک پرتھوی راج اور سنجوگتا  
 نے دل کھول کر خوشیاں منائیں۔ ایک لمحہ کی جدائی  
 اُنکے لئے ایک سال ہو جاتی۔ کسی طرح ایک دوسرے سے  
 الگ ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ مگر اُن کے اچھے دل انصافیت  
 ہونے کو تھے۔

جے چندر کے دل میں پُرانی آگ اب بھی سناگ  
 رہی تھی بلکہ اب تو شعلے بھڑک اُٹھے تھے پرتھوی راج کی  
 زبردستی اور دلیری ایسی نہ تھی جس کو جے چندر ٹھنڈے  
 کلیجے برداشت کر لے جاتا۔ حسد اور نفرت نے جے چندر  
 کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ پرتھوی راج کی دشمنی  
 میں اندھا ہو رہا تھا۔ اس اندھے پن میں اُس سے ایک ایسی  
 حماقت سرزد ہوئی جس سے تاریخ کے پڑھنے والے بخوبی  
 واقف ہیں اور جس کی تلافی کسی صورت سے ممکن نہیں۔

اُس نے محمد غوری کو ہندوستان پہنچانے کی ترغیب دی۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آئے، دہلی فتح کرے جے چندر بھی اُس کی مدد کے لئے حاضر ہے۔ محمد غوری کے لئے خطِ جنت کے پروانے سے کم نہ تھا۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ راجپوتوں کی باہمی بخشش یقیناً اُس کے لئے فتح کا پیغام ہے۔

ایک مرتبہ تھا میسر کے میدان میں پٹھان فوج بھر آجی۔ جے چندر اپنے راجپوت جوانوں کے ہمراہ دشمنوں میں جا ملا۔ غوری نے اُس کی خاطر مدارات میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر پرتھوی راج اور سنجوگت کے لئے یہ خبر تیر و نشتر کا کام کر گئی۔ اُن کی نظروں میں آ جے چندر کی وقعت ایک غدار سے زیادہ نہ تھی جس نے ملکِ ملت کو غیروں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ سنجوگت



کو بھلا کب گوارا تھا کہ اُس کا شوہر اپنا فرض ادا کرنے  
 میں کوتاہی کرے۔ اُس نے راتھوڑ بہادر کو جو ابھی مٹی مٹی  
 کے مزے لے رہا تھا چونکایا۔ خود اپنے ہاتھوں سے اُسکے  
 ہتھیار باندھے۔ تلوار کمر سے لگائی اور رخصت کر کے  
 کہا۔ ”میرے مالک! میرے غیرت دار سرتاج! اگر تم کامیاب  
 لوٹے تو ہندوستان ہمیشہ کے لئے بچ جائیگا۔ اور دھرم کی  
 لاج رہ جائے گی۔ تمہاری نیک نامی ہوگی۔ وطن کی  
 حفاظت کا سہرا تمہارے سر پہ گرا۔ اور اگر تم لڑائی میں  
 کام آگئے تو ایک بہادر راجپوت کی موت تم کو نصیب  
 ہوگی۔ ملک و ملت کے لئے تمہاری قربانی قابلِ دُعا  
 ہوگی۔ ہم تم سو رنگ میں پھر ملیں گے۔ جہاں ہم کو دلی  
 مسرت نصیب ہوگی۔ تمہارا نام ملک کے لئے جان دینے  
 والوں کی فہرست میں رکھے اوپر ہوگا۔ تم جہاں نشاری

اور وقت کی ایک مثال قائم کر جاؤ گے۔ جاؤ اور ملک سے  
قربان ہو جاؤ۔“

تھانیس سر کی دوسری لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ پرتھوی  
راج کا کیجہ تھا جو آخر وقت تک اس گھمسان لڑائی میں  
قدم جائے رہا۔ مگر آخر کار زخمیوں سے چور ہو کر گھوڑے  
سے نیچے آ رہا۔ اور ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو رہا۔  
جس وقت سنجوکتا کو یہ خبر پہنچی اُس کو کوئی ہراس  
نہ ہوا۔ لبوں پر وہی اگلی سی مسکراہٹ تھی اور چہرے  
سے وہی اطمینان نمایاں تھا۔ اُس نے اپنی سہیلیوں  
کو حکم دیا۔ ”چتا تیار کرو۔“ آگ جب غیب بھڑک گئی تو ہنستے  
ہوئے سنجوکتا نے اپنے پھول سے نازک جسم کو اُسکے حوالہ کر دیا  
اور اپنے بہادر سترنج سے سوگ میں جا ملی۔  
”قربان ہونے والے کے قربان جائیے“

## پدمنی

تیرہویں صدی کا آخری دور تھا۔ ملک میواڑ ایک  
نوجوان کم سن شاہزادہ لکشمن سنگھ کے زیر حکومت تھا۔  
میواڑ راجپوتانہ میں واقع ہے۔ اس کو لوگ بھادروں اور  
نام آوروں کا دیس کہتے ہیں۔ شاہزادہ بہت کم سن تھا  
سلطنت کا کاروبار سنبھالنا اُس کے لئے سہل کام نہ تھا  
اس لئے اُس کے چچا نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے  
لی۔ شاہزادہ کا نام بھیم سنگھ تھا۔ میواڑ کی راجدھانی چوڑ  
تھی۔ اب تک اُس کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اور اُجڑی ہوئی  
عمارتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ  
بڑا شہر رہا ہوگا۔ بھیم سنگھ نے ایک حسین لڑکی سے شادی  
کی تھی۔ نام اُس کا پدمنی تھا۔ وہ لنگا کے چوہان راجہ مرگھ

کی بیٹی تھی۔ پدمنی اُس کا نام کیوں پڑا؟ کہتے ہیں بڑی  
 خوبصورت تھی۔ اور ایک کھلے ہوئے کنول سے مشابہ  
 تھی۔ اُس کا نام خود ہی اُس کے حُسن کی دلیل ہے۔ اُسکی  
 صورت دیکھ کر لوگ ذنگ رہ جاتے تھے۔ شاعروں کا بیان  
 ہے کہ پدمنی کے حُسن صورت اور حُسن سیرت کی پوری  
 تعریف کرنا محال ہے۔ اُسکی آنکھیں ستاروں کو ماند کر دیتی  
 تھیں۔ اُس کا بدن گلاب سے زیادہ نازک اور ملائم  
 تھا۔ اُس کے دانت موتیوں سے زیادہ خوبصورت اور  
 آبدار تھے۔ اور اُس کے رنگیں ہونٹ یا قوت کو مات کرتے  
 تھے۔ اُس کی سُبک خرامی لوگوں کے دلوں کو پائمال  
 کر دیتی تھی۔ جیب وہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بٹ  
 پانی کی سطح پر تیر رہی ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ اُس کے  
 دل میں رحم اور خدا ترسی بھی بے انتہا تھی۔ وہ سخی بھی اُسی

تھی جس قدر وہ حسین تھی۔

جس زمانہ میں پدمنی کے حُسن و جمال کا چرچا بچہ بچہ کی زبان پر تھا، وہی میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ نام اُس کا سلطان علاء الدین خلجی تھا۔ پدمنی کی خوبصورتی کا شہرہ اُس کے کانوں تک بھی پہنچا۔ درباریوں نے کچھ ایسا شوق ولایا کہ سلطان کے دل میں غائبانہ محبت کا بیج پڑ گیا۔ اور پھر پدمنی کی دُھن ایسی سواہ ہوئی کہ اُس نے طے کر لیا کہ پدمنی میرے حرم میں آکر رہے گی۔ اُس کا دھیان سلطان کو ہر وقت بے قرار رکھنے لگا۔ اُس کی خیالی تصویر سلطان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ دن کا چین خست ہو گیا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ محل میں شکار میں تو یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی ایسے ایک خیال تھا اور ایکے من۔ وہی ایک رزو

اور وہی ایک فکر۔ کس طرح اُس دُربے بہا کو چتور سے اڑا  
 لاؤں؟ کیونکر اُس کنول کے پھول کو وہاں سے توڑ لاؤں؟  
 کیونکر اُسکی پرستش کروں اور اُس کو اپنے گلے کا ہار بنائوں  
 آخری تدبیر جس پر وہ اب عمل کرنے والا تھا یہ تھی کہ چتور کا حصار  
 کیا جائے۔ اور اس طرح قلعہ فتح کر کے پدمنی کو حاصل کیا جائے  
 اسکے سوا چارہ کار ہی کیا تھا؟ ادھر سلطان نے فیصلہ  
 سنایا ادھر کوچ کا سامان شروع ہوا۔ چتور کا محاصرہ تو آنا فانا  
 ہو گیا مگر لڑائی نے طول کھینچا۔ چتور پر قبضہ کر لینا بچوں کا  
 کھیل نہ تھا۔ بہادر راجپوت ہتھیلی پر سر لئے لڑتے تھے۔  
 اُنھوں نے قسم کھالی تھی کہ ہم آخر وقت تک سر نہ جھکائیں  
 اُن کو عزت زندگی سے کہیں عزیز تھی اُن کے لئے جان پر  
 کھیل جانا آسان تھا۔ مگر اپنی ملکہ پدمنی کو دشمن کے حوالے  
 کرنا ناممکن تھا۔ پدمنی سائے چتور کی آبرو تھی۔ اُسکی حفاظت

اُن کا دین و ایمان تھا۔

آخر کار سلطان کو یقین ہو گیا کہ میری سعی رائگاں  
 ہو گئی اور میری ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اب  
 بحرِ حکمتِ عملی سے کام لینے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اس  
 راجہ کو یہ پیغام بھیجا کہ تم صرف اتنی اجازت دے دو کہ  
 اُس شخص کی دیوی کو ایک نظر دیکھ لوں۔ راجپوت سر  
 زادیوں میں بھی پردہ کی رسم تھی۔ کوئی انہیں بے حجاب  
 نہیں دیکھ سکتا تھا۔ راجہ نے جواب میں کہلایا کہ پڑنی سنا  
 تو نہ آئے گی ہاں آئینہ کے مقابل رخ کر کے کھڑی ہو جائیگی  
 سلطان محض عکس کی زیارت کرے۔ کشتہٴ محبت سلطان  
 نے اسی کو غنیمت جانا۔ فوراً حامی بھر لی۔ پیغمبرِ سنگ  
 نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اسکی سخاوت تھی جس نے سلطان  
 کے سوال کو رد نہ ہونے دیا۔ بادی النظر میں تو یہ کہا جاتا

کہ بھیم سنگھ کی مجبوریاں تھیں جو اس سے سب کچھ  
 کر رہی تھیں۔ علاء الدین چند ہمراہیوں کے ساتھ قلعہ  
 میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر تک آئینہ میں پدمنی کے رخ  
 بے نقاب سے دل بہلاتا رہا۔ پھر قلعہ سے باہر آنے کا  
 قصد کیا۔ راجہ کی اس خاطر اور ہمدردی کا دل کھول کر  
 شکریہ ادا کیا۔ دستور اور رولج کے مطابق راجہ سلطان  
 کو چند قدم پہنچانے کے لئے قلعہ سے باہر آگیا۔ اسکو خوا  
 میں بھی اس کا گمان نہ ہوا تھا کہ لشکر کے الفاظ میں دغا  
 اپنا کام کر رہی ہے۔ سلطان راجہ کی نوازشوں کے گیت  
 گاتا جا رہا تھا۔ اور راجہ اپنے دل میں سرور ہو رہا تھا۔  
 یکایک سلطان نے رخ بدلا۔ ابرو کے ایک اشارے  
 میں کچھ آدمی دوڑے اور راجہ کو حراست میں لے لیا۔ وہ  
 آدمی پہلے سے اس کام پر تعینات کر دئے گئے تھے۔



راجہ نے بھی تلوار کھینچ لی۔ چاہتا تھا کہ سلطان  
 کو بہادری کے جوہر دکھائے۔ مگر اکیلا دم کہاں تک لڑتا۔  
 آخر مغلوب ہو گیا۔ پٹھان اُس کو قید کر کے دہلی لے گئے  
 بھیم سنگھ کی مہاں نوازیوں کا سلطان کی طرف  
 سے یہ بدلہ دیا گیا۔ احسان فراموشی ہے تو بدترین گناہ  
 مگر افسوس عشق نے سلطان کی عقل پر پردہ ڈال رکھا  
 تھا۔ پدمنی کی محبت میں وہ اندھا ہو رہا تھا۔ اُسے نیک  
 و بد کی کوئی تمیز نہ رہی۔ اور کلنک کاٹیکا اُسکی پیشانی  
 پر لگ کر رہا۔

جب یہ وحشت خیر خیر پھیل چلی تو چوہر کے لوگ تمللا  
 گئے۔ اور پدمنی کے صدمہ کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔  
 دُنیا اُس کی نظروں میں تیرہ و مار ہو گئی۔ سلطان نے بھی  
 ایک پل صنایع نہ ہونے دیا۔ پدمنی کو پیغام بھیجا۔ ”راجہ

کی خیر چاہو تو خود کو سلطان دہلی کے حوالہ کر دو۔“

پدمنی بھی راجپوت تھی۔ غیرت جوش میں آئی  
مگر کہہ ہی کیا سکتی تھی؟ اس ستا خانہ پیغام پر چیں چیں  
ہو کر رہ گئی۔ مگر وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی ذلی و ذہین بھی  
تھی۔ غور کرنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح سلطان کو ترک دینا  
چاہئے۔ اُس نے اپنے چچا گورا اور اُس کے بھتیجے بمل  
کو طلب کیا۔ رد و کہ کے بعد یہ بات طے پا گئی کہ راجہ کی  
رہائی بھی ممکن ہے اور اس میں پدمنی کی زندگی اور اُسکی  
عصمت و عفت بھی محفوظ رہے گی۔

جب تمام کارروائیاں مکمل ہو گئیں تو اُس نے  
سلطان کو جواب میں کہلایا کہ میں سلطان کے محل میں  
آنے کو تیار ہوں۔ شرط اتنی ہوگی کہ دہلی تک میسرڈولہ  
اُسی شان کے ساتھ جائے جو ایک شاہزادی کے لئے

موزوں ہو۔ اُسکی لونڈیاں بانڈیاں اور اُس کے اپنے  
 ہی آدمی ساتھ ہوں گے۔“ اس نے یہ شرط بھی پیش کی  
 کہ ”کوئی متنفس اُس کے پاس تخیہ میں آنے کی جرأت  
 نہ کرے۔“

جب یہ خوش خبری سلطان کو ملی وہ ماہے خوشی  
 کے اچھل پڑا۔ وہ اپنے کو بے حد خوش قسمت تصور  
 کرنے لگا کہ پدمنی اس آسانی سے اُس کے دام میں  
 آگئی۔ وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ پدمنی کو حاصل کر لینا  
 آسان نہیں ہے۔ ابھی اُسے نہ جانے کیا کیا زحمتیں برداشت  
 کرنا ہوں گی۔ اُس نے جھٹ پدمنی کے پاس کھلا بھیجا کہ  
 ”بہ سو چشم تھاری شرائط کو منظور کرنا ہوں۔ تمھاری اور  
 تمھارے آدمیوں کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں۔ او  
 جس شان و شوکت سے چاہو دہلی چلو۔ پدمنی نے ادھر

مطلبن ہو کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سات سو ڈولے حاضر  
 کریں جس پر نہایت بیش قیمت اور خوب صورت پرفے پڑے  
 ہوں۔ جب ڈولے آگئے تو ہر ڈولے میں چتورے کے ایک نمونہ  
 بہادر کو اس میں بٹھایا۔ اور ہر ڈولے کو چھ مسلح سپاہی کھار  
 کے بھیس میں دہلی کو پہلے۔ خود محل میں بیٹھی اپنی انوکھی تہمیر  
 کی کامیابی کا انتظار کرنے لگی۔

جب سلطان نے ڈولوں کے اتنے بڑے جلوس کو آتے  
 دیکھا تو پھولا نہ سما یا۔ دل مائے خوشی کے بانسوں اُچھلنے لگا۔  
 وہ اب اس کی منتظر تھا کہ پد منی کب میرے خیمہ کو اپنے قدموں  
 فردوس بناتی ہے۔ پالکیاں کہیں تک آئیں اور ٹھہریں۔  
 اب ایک آخری منہ تھی جو پد منی کی طرف سے سلطان کی خدمت  
 میں پیش ہوئی وہ یہ تھی کہ اب میں اپنے پہلے شوہر کا حکم  
 سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا چاہتی ہوں اُسے آخری بار

ایک اور صرف ایک نظر دیکھ لینے کی اجازت دے دی جا  
 سلطان کو کسی قسم کے دھوکے اور فریب کا گمان بھی نہ تھا  
 اُس نے یہ درخواست منظور کی۔ بھیم سنگھ کو نصف گھنٹہ تک  
 پدمنی سے گفتگو کرنے کا موقع دیا گیا۔ راجہ ایک پالکی میں  
 داخل ہوا جو سب کی آنکھوں میں خاک جھونکے دہلی سے  
 چتور رخصت کر دی گئی۔ بقیہ جیوں کی تیوں ٹھہری رہیں۔  
 سلطان کو اب انتظار کی تاب نہ رہی نصف گھنٹہ سے زائد  
 ہو چکے تھے۔ اب اُسے کچھ شبہ پیدا ہوا کہ غالباً یہ کوئی نئی چال  
 ہے۔ پدمنی کی پالکی کی طرف لپکا کر وہاں کیا تھا، ایک مسلح  
 بہادر راجپوت۔ تعاقب ہوا مگر بے سود۔ راجپوت ایک ایک  
 کر کے خون میں لٹنے لگے مگر اتنا موقع نہ دیا کہ سلطان کے  
 سپاہی راجہ کو پھر گرفتار کر لیں۔

راجہ ایک برق دم گھوڑے پر قراٹے بھرتا چیتور کی

طرف اڑا جا رہا تھا سلطان کے آدمی بھی سچھا کرنے کے  
 لئے دوڑے۔ اور راجہ سے چند ہی قدم کے فاصلہ پہنچتے  
 کہ راجہ اپنے قلعہ کی پناہ میں آگیا۔ نا اُمید و نا کام سلطان  
 کو آن کر خبر دی۔ سلطان غصہ میں آگ بگولا ہو گیا اور ایک  
 مرتبہ پھر چٹور کا محاصرہ کر لیا۔ پھر ٹھسان مگر مختصر جنگ نے  
 گورا پد سنی کا چچا جو ہر مردانگی دکھاتا ہوا قتل ہوا۔ دونوں  
 طرف بے شمار جانیں تلف ہوئیں۔ گورا کی بی بی نے شوہر  
 کے قتل کا حال سنا تو بے حد خوش ہوئی۔ وہ بدل کی  
 زبانی یہ سن کر بے حد مسرور ہوئی کہ گورا بہتیروں کوتلو اے  
 گھاٹ اُتار کر قتل ہوا۔ اور پھر دستور کے مطابق مع چند  
 عورتوں کے اپنے جسم کو آگ کی نذر کیا۔ آگ میں کودتے  
 کودتے کہتے بھی اُس کی زبان سے یہی نکلا ”میرا شوہر  
 میرا منظر ہوگا۔“ علاء الدین اپنی بقیہ شکست خوردہ

فوج کو لے کر بھاگ بکھڑا ہوا۔

سالہا سال گزرتے گئے۔ مگر سلطان کی محبت کی آگ اُسی طرح بھڑکتی رہی۔ وہی چاند سا کھڑا دن رات اُس کی آنکھوں میں پھرتا رہا۔ اُسے کسی جگہ کسی گھڑی قرار نہ تھا۔ آخر کار اُس نے چتور کے محاصرہ کی پھرتیاری کر دی۔ ابھی راجپوت پچھلے نقصانات کی تلافی نہ کر سکے تھے کہ پھر وہی مصیبت سر ٹپ گئی۔ جس آفت سے نجات ملی تھی اُسی میں پھر مبتلا ہو گئے۔ باوجود جان توڑ کوشش کے راجپوت اس مرتبہ تاب مقاومت نہ لاسکے۔ راجہ نے بہتیری تدبیریں کیں مگر بے سود ثابت ہوئیں۔ راجپوت بہادر ایک ایک کر کے تلوار کی نذر ہوتے گئے۔ خود راجہ کے گیارہ بڑے اس مشہور جنگ میں کام آئے۔ صرف ایک لڑکا بچ رہا تھا۔ مجبور ہو کر راجہ نے زرو لباس زیب تن کیا۔ یہ نشانی تھی فتح کی

یاموت کی - راجہ زن میں آگیا اور داد مردانگی دیتا ہوا  
دُنیا سے رخصت ہوا۔

پدمنی فصیل پر کھڑی جنگ کا سماں دیکھ رہی تھی  
جب اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نہ راجپوت رہ گئے اور  
نہ راجہ تو اپنی سسیلیوں سے کہا "اب جیٹا بے کار ہے۔

بے عزتی کی زندگی سے موت کہیں بہتر ہے۔ آؤ! ہم لوگ بھی چوہ  
کی تانچ میں اپنا نام کر جائیں جب سلطان ہمارے آدمیوں کو  
قتل کر کے چوہرے کے قلعہ میں داخل ہو تو سو اسے آگ کے شعلوں

اور خاک کی ڈھیر کے اُسے کچھ ہاتھ نہ آئے۔" یہ مختصر سی تقریر  
تھی جس نے ساری عورتوں کے خون میں حرکت پیدا کر دی  
چتا تیار ہوئی اور عورتوں کا جلوس آگ میں کودنے کے

لئے آگے بڑھا۔ پدمنی نے دوبارہ عورتوں کو مخاطب کیا  
کہا "تم میں سے جس کو عزت سے جان پیاری ہو وہ میرے ساتھ



ساتھ نہ آئے۔ پیچھے ٹھہری رہ جائے۔ مگر کون عورت تھی جو پد منی کے ہم خیال نہ تھی۔ سب نے پد منی کا ساتھ دیا۔ پھول سے نازک جسم شعلوں کی نذر ہو گئے۔ اس طرح ”جوہر کی رسم“ ان راجپوت عورتوں نے ادا کی۔

سلطان فتح کے شادیاں بجاتا قلعہ میں بہ حیثیت فاتح کے داخل ہوا۔ اُس وقت سلطان کی منگیں بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ آج ایک مدت کی حسرت نکلے گی۔ پد منی سے دل کھول کر ملیں گا۔ اُس کے وہم دگمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ پد منی اس طرح نکلے گی۔

جب وہ آگ کے شعلے سے دوچار ہوا تو اسے جلنے والیوں کے حال پر ترس آ گیا۔ تھا تو بے حد سخت دل مگر اس دردناک منظر کی وہ بھی تاب نہ لاسکا۔ اُس نے

اپنے آدمیوں کو روک دیا اور حکم دیا کہ پرمی کا خوبصورت  
 محل یوں ہی لہنے دیا جائے۔ اسے مسمار نہ کیا جائے  
 چنانچہ وہ محل اب تک جھیل کے کنارے جاں باز رہی  
 کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔



## (۷) اہلیہ بانی

اب تک تمام کہانیوں میں ان بہادر اور جبری عورتوں کی  
 یاد تازہ کی گئی ہو جب کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر پھنسے حروف  
 میں اس طرح منقوش ہیں کہ زمانہ آنکو کبھی مٹا نہیں سکتا۔ ان  
 عورتوں نے اپنے اور اپنے ملک کے بدخواہوں کے مقابلہ میں  
 خدا داد جرات اور دلیری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ آخری  
 کہانی بھی دیکھنی سے خالی نہ ہوگی۔ یہ ایک پاکیزہ اور پاک طینت  
 رانی کا قصہ ہے جس کا نام ”اہلیہ بانی“ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس  
 رانی نے کوئی جنگی مہم نہیں سر کی۔ مگر جس امن و صلح اور سلیقہ  
 کے ساتھ ”اہلیہ بانی“ نے اپنی سلطنت کی دیکھ بھال کی، وہ  
 تاریخ میں قیامت تک یادگار رہے گا۔ اسکی شہرت اس کے  
 حسن انتظام ہی کے باعث ہوئی۔ مغرب کے مشہور شاعر

ملٹن کا قول ہے کہ "اس من امان کے ساتھ فتح کی شہرت جنگ  
 کی فتوحات کی شہرت سے کچھ کم نہیں ہوتی۔" اس سے اہلیہ  
 بانی کی تاریخی شہرت ملٹن کے خیال کی تائید کرتی ہے۔  
 اہلیہ بانی ایک غریب مگر مغز گھرانے کا چشم  
 و چراغ تھی۔ باپ کا نام آتندر اوسیندھیا تھا۔ جو  
 ایک معمولی کسان تھا۔ چند بیگے کھیت پر اُس کی اور اُسکے  
 اہل و عیال کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ ہاں اُس کو یہ  
 فخر ضرور حاصل تھا کہ وہ سندھیا کے مشہور شاہی خاندان  
 سے نسبت رکھتا تھا۔ ایک زمانہ تک اُس کو اولاد کی  
 حسرت رہی اور پوری نہیں ہوئی۔ مگر ۳۵ء میں اُسکی  
 مراد برآئی اور اُسکے گھر کو خدائے ایک بچی سے گلزار کر دیا۔  
 اس بچی کا اہلیہ دیوی کے نام اہلیہ بانی رکھا گیا  
 اہلیہ دیوی کو تم رشی کی بیوی تھی۔ گو تم رشی ہندوستان

کے اُن سات مشہور شیوں میں سے تھے جن کا نام بڑے  
احترام اور تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

الہیہ بانگی میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو  
ایک ہندو لڑکی کے شایاں ہیں طبیعت میں سادگی اور  
دل میں رحم اور خدا ترسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خیرات  
اور غریب نوازی، عبادت اور بندگی کا سبق اُس نے  
اُن قصوں اور کہانیوں سے حاصل کیا جو اُسکے ماں باپ  
اُس کو سنایا کرتے تھے۔ اسی ابتدائی تعلیم نے اُسکے دل  
میں ہمدردی، خلوص، قوم پرستی اور حبِ وطن کے  
بیج ڈالے۔

اس کی شادی کا واقعہ بھی عجیب و غریب تھا  
راؤ ہلکر ایک مرہٹہ سردار تھا۔ اتفاقاً اُس کا گزر اُس علاقہ  
میں ہوا جہاں الہیہ بانگی رہتی تھی۔ اُسکی عمر نو سال سے

زیادہ نہ تھی۔ فوج کی آمد کا غل سنا تو جیسا کہ بچوں کی عادت ہے  
 دیکھنے کے لئے دوڑی۔ مہرٹھ سردار پر اسکی سادگی اور اس کے  
 معصومانہ انداز نے جادو کا اثر کیا۔ اس کا دل بے اختیار اہلیہ  
 بانی کی طرف کھنچا اور اس نے شفقت پداری کے ساتھ اہلیہ  
 بانی کو گود میں اٹھالیا بڑی دیر تک پیار کرتا رہا۔ وہیٹ والوں  
 سے دریافت کیا لڑکی کس کی ہے؟ جب معلوم ہوا کہ سندھیا  
 خاندان کے معزز گھرانے کی بیٹی ہے تو اس نے اسنڈرا کو طلب  
 کیا اور اس سے کہا میں اہلیہ بانی کو اپنے رُکے کی دُھن  
 بنانا چاہتا ہوں کیا تمہیں بھی یہ رشتہ منظور ہے؟ غریبستان کی  
 خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ طھار راؤ کی زبان سے رشتہ کی آواز  
 اسکو خواب و خیال کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تو اسکی  
 سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ مگر جب ہلکے زانپتی آرزو کا  
 دوبارہ اظہار کیا تو وہ مائے خوشی کے پھولانہ سیایا۔ اسنے ہلکے کو

ہزاروں عائیں دیں۔ اُس نے جو احسان کیا غے کیسا ان پر کیا تھا  
 اُس کا بدلہ ناممکن تھا۔ شادی کی خوشیاں اعلیٰ پایہ پر منائی گئیں اور  
 تمام پوربی رسمیں ادا کی گئیں۔ ”والہیہ بانی“ دو وطن بنکر اپنے شوہر  
 کے گھر آئی۔

اپنی سعادتمندی اور خوش سلیقگی کی بدولت الہیہ بانی سرسبز  
 میں سب کو عزیز تھی۔ اُس نے ساس۔ سر اور شوہر سب کا دل موہ لیا  
 ”ہلکر“ بڑا تنکے اچھا تھا۔ بہت جلد جامہ سے باہر ہو جاتا تھا۔ ذرا سی  
 غلطی معمولی سی خطا اُس کے مزاج کو برہم کر دیتی تھی۔ مگر الہیہ بانی  
 کی شیریں کلامی اور نرمی ”ہلکر“ کے غصہ کو بہت جلد ٹھنڈا کر دیتی تھی  
 اُس کی محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ ”الہیہ بانی“ نہ صرف خانہ داری کے  
 انتظام کی نگرانی کرتی تھی بلکہ دوسروں کا ہاتھ بھی بٹالیتی تھی  
 قاعدہ ہے کہ فلاکت کی سختیاں جھیلنے کے بعد عیش و عشرت کا  
 زمانہ انسان کو مغرور بنا دیتا ہے۔ الہیہ بانی اس عیب سے پاک تھی۔

جاہ و ثروت پانے کے بعد بھی اُس میں ہی سادگی و سہمی  
معصومیت اور وہی ہندو سی تھی۔ وہ معمولی گھرانوں کی عورتوں  
کی طرح اپنے ہاتھ سے گھر کا کام دھند کرتی تھی اور بیجا نزاکت  
و نفاست کو کبھی راہ نہیں دیتی تھی۔

شادی کے نو سال بعد اہلیہ بانی کی قسمت نے پٹا کھایا  
اہلیہ بانی کا پیارا شوہر ایک جنگ میں کام آگیا۔ اور اُسے  
زندہ پائے کی کٹھن گھڑیاں کاٹنے کے لئے چھوڑ گیا۔ زمانہ کی سم  
کے مطابق اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ شوہر کے ساتھ سستی ہو جا  
مگر بوڑھے اور ضعیف ہلکے نے آبدیدہ ہو کر کہا بیٹی! ایک ہی  
پتھر تھا جو داغ دے گیا۔ بقیہ زندگی کا سہارا لے دے کر تو تھی  
جو اب ساتھ چھوڑنے پر تلی ہے۔ اگر ایسا کیا تو اس بڑھے کا خدا  
حافظ ہے۔ میری سن! بڑھے کی بے کسی پر ترس کھا اور اپنے  
ارادہ سے باز آجا!۔ "بوڑھے ہلکے پر دردالتجا سے اہلیہ بانی



کا عزم و استقلال کمزور ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ مُردہ سے زیادہ زندہ قابلِ توجہ ہے۔ بڑھے سنسر کا دل توڑنا اچھی بات نہیں۔“

اُس گھڑی سے اہلیہ بانی نے ہلکے کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ امورِ سلطنت میں اہلیہ بانی ہلکے کا زبردست ہاتھ بنتا ہوئی سلسلہء عمر میں جب ہلکے پانی پیت کی جنگ میں شریک ہونے لگا تو سلطنت کا کام اہلیہ بانی کے سپرد کر گیا۔ جب واپس آیا تو اہلیہ بانی کے انتظام سے سجدِ غُوش ہوا۔ کہیں کسی قسم کی خرابی نہیں پائی گئی۔ اُس نے اہلیہ بانی کو بڑی شائستگی دی اور اُس کا دل بڑھایا۔

سلسلہء عمر میں ہلکے کو نیا سے رخصت ہوا۔ اہلیہ بانی کا کلم سن بچہ راج پاٹ کا مالک بنے۔ مگر وہ بیوقوف اور نا عاقبت اندیش ثابت ہوا۔ رعایا سختی سے عاجز تھی اور درباری اسکی

بدسلکیوں سے بظن تھے۔ ریاست کی خوش قسمتی تھی کہ موت نے اُس کم سن اور ناقص عقل راجہ کا خاتمہ کر دیا۔

اب اہلیہ بانی نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی پیشوائے بھی سند عطا کر دی چونکہ کوئی مرد نہ تھا۔ گدی کی مالک بنتا وہی قرار پا گئی۔ رکھونا تھراؤ پیشوا کا چچا تھا جس کی آگ اُس کے دل میں بھڑک اُٹھی اُس نے مخالفت کی اور چڑھائی بھی کی۔ مگر رعایا اہلیہ بانی کو "دیوی" سمجھتی تھی۔ تلوار تول کر مقابلہ پر آ گئے اور رکھونا تھراؤ کے دانت کھٹے کر دئے۔ اُس نے من مان کیسا پورے تیس سال حکومت کی۔ ایک انگریز مورخ کو اس بات کا اعتراض ہے کہ اہلیہ بانی کی حکومت اُچی حیرت انگیز تھی۔ "اندوڑا یک معنی لی قصبہ تھا۔ اہلیہ بانی نے اُسے ترقی دیکر ایک شہر بنادیا۔ اُسکی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ ملک غمے شحال ہو جائے۔ خود تکلیفیں اور زحماتیں برداشت کیں مگر مالودہ میں من قائم کر دیا۔ نہ صرف اُسکی

رعایا اسکی ہمدردی اور رحم سے مستفید ہوتی تھی بلکہ جنگل کے جانور، ہوا میں اڑنے والی چڑیاں، دریا کی مچھلیاں سبھی اسکی داد دہش اور فیض رسانی سے پورا فائدہ اٹھاتی تھیں۔

ہندوؤں میں خیرات ہی تمام نیکیوں کی اصل بتائی گئی ہے اہلیہ بانی کو سب پر مبنی تصور کرتے تھے۔ وہ مجسم سخاوت تھی۔ اس پاک باطن عورت نے تمام ہندوستان میں مندر اور دھرم شالے بنوائے گیائیں ”وشنوجی“ اور بنارس میں شیشیر کا مندر اسکی یادگار ہیں۔ ان تمام مذہبی امور میں بے حساب دولت صرف ہوئی مگر گھارے راؤ کا خزانہ خالی ہونے والا نہ تھا۔ خزانہ سے غریب کو کھانا اور کپڑا دیا جاتا تھا۔ محتاج ساری سلطنت میں ڈھونڈھے نہ ملتے تھے۔ ”وندھیا“ کی پہاڑی وادیوں پر دشوار گزار راستوں سے ایک بزرگ نکالی جس سے آمد و رفت آسان ہو گئی۔ عوام کی خیر اندیشی نے رعایا کو اہلیہ بانی کا گرویدہ بنا دیا۔ اس کے

خلاف بغاوت کا خیال لوگ گناہ سمجھنے لگے تھے۔ کوئی  
 اُس کی حکومت سے نالاں نہ تھا۔ وہ اپنے کو اپنے رعایا  
 کی خدمت گزار سمجھتی تھی۔ قصع اور تکلف کو پاس پھٹکنے نہیں  
 دیتی تھی۔ اُس کا ہر قدم رعایا کی فلاح و ہیود کے لئے اٹھتا  
 صبح شام رعایا اور سلطنت کی ہیود ہی کی فکر و امنگیں رہتی  
 تھی۔ مشرق یا مغرب کے سلاطین میں اس کی نظیر ملنا بہت  
 دشوار ہے۔ پاک باطنی اور سادگی میں وہ سلطان ناصر الدین  
 کی ہمسرہ تھی۔ مذہبی آزادی میں "اکبر" کی، اور رحم اور سخاوت  
 میں "اشوک" کی ہم قدم تھی۔

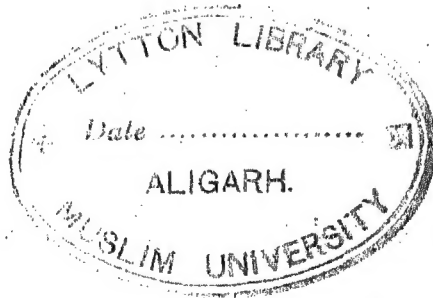
سر جان مالک نے متعدد واقعات اُسکی ہمدردی  
 کے بیان کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رعایا کی بھلائی کا اسے  
 بے حد خیال تھا۔ انصاف کا خون کبھی روا نہ رکھتی تھی۔  
 مقدمات کا فیصلہ کرنے میں جانبداری کو راہ نہ دیتی تھی۔

ایک امیر سا ہو کارِ قضا کر گیا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جائیداد ریاست نے ضبط کر لی۔ سا ہو کار کی بیوی نے اہلیہ بانی کی خدمت میں عرضی بھیجی۔ اہلیہ بانی نے ساری ملکیت سا ہو کار کی بیوہ کو واپس کر دی۔ اپنے ملازموں اور کارکنوں کو رعایا پر ناجائز سختی کرنے سے روکتی رہتی تھی۔ اس طرح کے سیکڑوں سلوک تھے جنکی بدولت اب تک اُس کا نام زندہ ہے۔ اور لوگ اُس کی پرستش کرتے ہیں۔

اُس کی روزانہ زندگی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بہت پرہیزگار، منصف مزاج، او سادہ لوح تھی۔ علی الصبح اُٹھتی، نہاتی، عبادت کرتی پھر بیوکوں اور غریبوں کو شکم سیر کھانا کھلاتی اور خیرات تقسیم کرتی۔

خود اس کی غذا بالکل سادہ تھی۔ گوشت تو چھوٹی نہ  
 تھی۔ دو بجے دربار لگتا تھا۔ اہلیہ بانی صبر اور استقلال  
 کے ساتھ مقدمات کو سنتی اور نہایت متانت اور سنجیدگی  
 کے ساتھ فیصلے سناتی۔ دربار چار بجے تک لگا رہتا۔ کوئی  
 کام کل پر نہ چھوڑا جاتا۔ چھ بجے عبادت خانہ میں چلی جاتی  
 وہاں سے فراغت پا کر کھانا کھاتی جو بالکل سادہ ہوتا۔ اسکے  
 بعد وزراء کے مشورہ سے خفیہ معاملات کو طے کرتی۔ یہ تھے  
 اہلیہ بانی کے عادات حسنہ اور یہ تھے اسکے اخلاق حمیدہ  
 دربار میں ہوتی یا گھر میں کسی کے ساتھ ترش روئی  
 سے پیش نہ آتی۔ ہاں جب کسی بد معاش کو سزا دینا مقصود  
 ہوتا تو البتہ غصہ کا اظہار کرتی۔ اس کے بعد پھر غصہ کی کوئی  
 علامت باقی نہ رہتی۔ وہی متانت وہی سنجیدگی پھر  
 چہرہ سے ٹپکنے لگتی۔

خوشامد سے اہلیہ بانی کو نفرت تھی۔ سر مالک کہتا ہے  
 ”اہلیہ بانی اُن عورتوں میں سے تھی جن میں غرور اور خود  
 نمائی کا مادہ بالکل نہیں ہوتا۔ اُس کے حسن سیرت کا پورا  
 مرقع پیش کرنا دشوار ہے۔ یہ کہنا مبالتہ نہ ہوگا کہ اس کی  
 نظیر دنیا کے پرہیزگار اور ضرب المثل حکمرانوں میں مشکل سے  
 ملے گی۔“







Kam Babu Saksena Collection

२२१  
(८८)

१२.५.५८

**DUE DATE**

२२ ५.८

Ram Babu Saksena Collection.

२२१

१२.३.४१

(८४)

२२५.८

Date	No.	Date	No.

